بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شعری جواہرات اور ضرب الامثال

مؤلف: محمد رمضان عبدالشکور

کتاب کا نام : شعری جواہرات اور ضرب الامثال

مؤلف : محمد رمضان عبدالشکور

ناشر : ڈاکٹر عبدالماجد M.Com لیکچرر مہاراشٹر کالج، ممبئی

ایڈیشن : پہلا

سن اشاعت : جنوری ۲۰۰۸ء

تعداد : پانچ سو

سرورق : رشید آرٹسٹ، مالیگاؤں Mob.9890856409

طباعت : اقصیٰ آفسیٹ پرنٹرس، مالیگاؤں PH: (02554) 230945

کمپوزنگ : عقیل ورلڈ ڈی ٹی پی سینٹر، مالیگاؤں Mob.9860295151

صفحات : ایک سو اڑتالیس

قیمت : پچاس روپے

ملنے کے پتے

۱) 447، دسویں گلی، اسلامپورہ، مالیگاؤں
Ph: (02554) 232961

۲) 303، پہلا منزلہ، نوبل ہاؤس، ایم ڈی روڈ، ممبرا، تھانہ
Ph: (022) 25466950 Mob. 9869679392

۳) اطفال بک ڈپو، محمد علی روڈ، مالیگاؤں

۴) شوقی کتاب گھر، بدر کا باڑہ، مالیگاؤں

انتساب

ان تمام لوگوں کے نام ....

جو اچھے شعر کے قدر دان ہیں۔

محمد رمضان عبد الشکور

فہرست

فہرست

اعتراف

مجھے اعتراف ہے کہ

زندگی کے ابتدائی ساٹھ سال تک میرا مطالعہ محض نثری ادب تک ہی محدود رہا۔ شعری ادب کا مطالعہ یوں کہیۓ کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس تمام عرصے میں از اول تا آخر نظم کی صرف ایک ہی کتاب میں نے پڑھ رکھی تھی اور وہ تھی دیوانِ غالبؔ۔ اسکے تمام اشعار اس وقت تو کیا آج بھی سمجھ نہیں سکتا۔ تاہم جتنے بھی سمجھ میں آئے وہ دل و دماغ میں بس گئے۔ ان سے میں نے نہ صرف اپنے شعری ذوق کی تسکین کی بلکہ انھیں سُروں سے آراستہ کر کے جمالیاتی حس کی پرورش بھی کی۔

مجھے اعتراف ہے کہ

جب ممبئی کے جاوید کامل صاحب نے گفتگو کے دوران درجنوں ایسے واحد مصرعے جو ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہیں، سنانے کے بعد مجھ سے ان کے ثانی مصرعے پوچھے تو دماغ پر بہت کچھ زور دینے کے باوجود میں ایک مصرع بھی یاد نہیں کر سکا۔ اس دن مجھے اپنی اس لاعلمی کا نہ صرف شدید احساس ہوا بلکہ منظوم ادب سے دوری پر افسوس بھی ہوا۔

جاوید کے سنائے مصرعوں میں سے چند ایک یہاں درج کر رہا ہوں تا کہ قارئین بھی تھوڑی دیر کیلئے اپنی اپنی یادداشت کا امتحان کر لیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ O وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے O کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا O چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی O عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا O گر قبول اُفتد زہے عز و شرف O زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

میری ناکامی کے بعد جاوید نے خود ہی تمام مصرعوں کے ثانی مصرعے شعرا کے مکمل ناموں کے ساتھ سنا دیئے۔ مجھے یہ مظاہرہ بہت اچھا لگا اور بس وہی اس مجموعے کیلئے محرک بن گیا۔ اس کے

بعد میں نے مسلسل کئی سال تک حتی المقدور قدیم، مابعد اور موجودہ عہد کے مشہور و مقبول اساتذہ شعراء کے دستیاب دواوین اور کلیات کا پوری توجہ اور دلچسپی سے مطالعہ کیا اور ان میں سے نہ صرف وہ اشعار چنے جو ضرب المثل کے طور پر زبان زد ہیں بلکہ ان کا بھی انتخاب کیا جو میری سمجھ کے مطابق شعری جواہرات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ

یہ انتخاب نامکمل ہے۔ ابھی اس میں بہت سارے مستحق شعرا کا کلام شامل ہونا باقی ہے۔ انتخاب کے متعلق بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ اس میں متعدد خامیاں موجود ہیں۔ بے شک اسے اور زیادہ بہتر ہونا چاہیے تھا۔ مجموعے میں جن شعرا کا کلام شامل ہے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

(کمپیوٹر میں لفظ کیجے ٹائپ کرنے پر ''کیجے'' ہو جاتا ہے۔ اس لئے کیجے کو مجبوراً ''کی جے'' اس طرح کرنا پڑا اور ضرب المثل مصرعوں کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔ مختلف بحروں اور غزلوں کے اشعار کو لکیروں کے ذریعے علیحدہ کیا گیا ہے۔)

محمد رمضان عبدالشکور

مرزا محمد رفیع سودا

نہ جیا تیری چشم کا مارا	نہ تری زلف کا بندھا چھوٹا
کہاں نطقِ فصیح از طبع نا ہنجار ہو پیدا	فغانِ زاغ سے طوطی کی کب گفتار ہو پیدا
خدا دیوے پسر تو قابل تحسین دے ورنہ	پدر ہے موجب نفریں جو نا ہنجار ہو پیدا
ہستی سے عدم تک سفرِ چند کی ہے راہ	دنیا سے گزرنا سفر ایسا کہاں کا ہے
آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا	کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے	دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا
اے برق کس طرح سے میں حیراں ہوں تجھ کنے	نقشہ ہے ٹھیک دل کے مرے اضطراب کا
یہ کہا شیخ سے شیطاں نے کہ آ ہم سے مل	آشنا مت ہو تو سودا سے خراباتی کا
گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا	لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت دیں کو	خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا
طلب نہ چرخ سے کر نانِ راحت اے سودا	پھری ہے آپ یہ کاسہ لئے گدائی کا
جو کہ ظالم ہے وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں	سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھی شمشیر کا
آہ و نالے سے مرے دل نہ پسیجا اس کا	میں ہوا سے نہ کبھی سنگ پگھلتے دیکھا
تیغ کا زخم اٹھا سنبھلے ہے انساں لیکن	سامنے تیر نگہ کے نہ سنبھلتے دیکھا
دامانِ داغ و تیغ کو دھویا تو کیا ہوا	عالم کے دل سے داغ دھلایا نہ جائے گا
عشق کی بھی منزلت کچھ کم خدائی سے نہیں	ایک سا احوال یاں بھی ہے گدا و شاہ کا
جز جوہری کیا جانے کوئی قدر جواہر	سمجھے ہے سخن رس ہی سخن میری زباں کا
پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا	الٰہی ان نے ان داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

چھوٹا جو زلف سے تو پھنسا دام خط کے بیچ
یہ مرغ دل ہمیشہ گرفتار ہی رہا

جس مغبچے سے پیالہ پیتے نہ تھے ہم، ان نے
دھنیے کی کھوپڑی میں پانی ہمیں پلایا
رونے نے کیا حالِ دل اس شوخ پہ روشن
سوداؔ نے دیا عشق کا پانی سے جلایا

نہ قصدِ کعبہ ہے دل میں نہ عزمِ دیر بندہ ہوں
گلے میں ڈال کر رسی جدھر چاہے ادھر لے جا

کہتے ہیں عشق جس کو مت پوچھ ہے وہ کیا شئے
اک زہر ہے کہ جن نے پیر و جوان مارا
سوتے سے رات کروٹ ان نے نہ لی اور اپنی
آہ و فغاں نے برہم سارا جہان مارا
سوداؔ کو بات کرتے تجھ سے کبھو نہ دیکھا
کب کس گنہہ پہ تو نے وہ بے زبان مارا

ڈروں ہوں بہہ نہ جائے شہر بندھ کرتا ررونے کا
نظر آتا ہے پھر آنکھوں میں کچھ آثار رونے کا

بے تصنع تجھے کہتا ہوں یقیں کر سوداؔ
گل جدا شاخ سے جس دم ہوا کہ مرجھایا

زلف دیکھوں یا کمر، یا چشم، یا ابرو کی سمت
اتنی راہیں دل کے گم ہونے کی لوں کیدھر سراغ

بچے تو بچ رہے انکھیوں سے دل مرا لیکن
غضب ہے یہ کہ ہیں صیاد دو، شکار ہے ایک

کیفیتِ چشم اس کی تجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

غیر سے تجھ کو جو صحبت ہو تو ہو کیا کی جے
کون سا گل ہے جو رکھتا نہیں خارِ دامن

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

کہتا ہے یہ تب سوداؔ، لاحول ولاقوۃ
ولیوں کے بھی نطفے سے شیطان نکلتے ہیں

ابرو نے، مژہ نے، نگہ یار نے یارو
بے رتبہ کیا تیغ کو، خنجر کو، سناں کو
بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اس آفت جاں کو
اور دیکھنے دوں میں نہ زمیں کو نہ زماں کو

خرمنِ برق زدہ کا ہوں وہ دانہ کہ مجھے
نہ کوئی مرغ چگے، نے کوئی بووے مجھ کو

جھگڑا تو حسن و عشق کا چکتا ہے پل کے بیچ
گر محکمے میں قاضی کے وہ روبرو نہ ہو

گزری سو گزری اہل زمیں او پرائے فلک
آئندہ یاں تلک تو کوئی خوب رو نہ ہو

دل دار اس کو خواہ دل آزار، کچھ کہو
سنتا نہیں کسی کی مرا یار کچھ کہو

کوئی سسکے، کوئی تڑپے ہے کوئی ہے بے حس
آج دیکھے ترے کوچے میں گرفتار کئی

عشق ہی شرط ہے کیا اک مرض الموت مجھے
یارب انسان کے مرنے کو ہیں آزار کئی

شیخ مجھ کو نہ ڈرا اپنی بڑی پگڑی سے
ایسی تو دیکھی ہیں میں گنبد و دستار کئی

آئے وہ بزم میں جو اٹھا چہرے سے نقاب
پروانہ ہی کو شمع سے بے زار کر چلے

سخن مرا ہے مقابل مرے، سخن کے میں
کہ میں سخن سے ہوں مشہور اور سخن مجھ سے

آتے نہیں نظر میں کسی کی جو ہم تو کیا
عالم تو سب طرح کا ہماری نظر میں ہے

زبان وہ ہے کہ ہلنے میں جس کے ہو کچھ فیض
وگرنہ یوں حرکت میں زبان ہے سب کی

دانۂ اشک سوا کچھ نہیں اس سے حاصل
عشق کا کھیت بہت ہم نے بوا، جوتا ہے

کیا تنگ مایہ کی ہمت سے پڑے گی پوری
کاسہ لبریز کہیں اوس سے بھی ہوتا ہے

جائے کم ظرف کے دروازے پہ جو اے سوداؔ
حرمت اپنی وہ گدائی کی عبث کھوتا ہے

شکوہ ہے جور و جفا کا ترے کس کافر کو
مجھ پہ جو گذری ہے میری ہی وفاداری سے

ہے قسم تجھ کو فلک دے تو جہاں تک چاہے
جلوۂ حسن اسے، حسرت دیدار مجھے

سوزش و داغ و الم، درد چلا میرے ساتھ
ہجر نے تیرے کیا قافلہ سالار مجھے

ماریں گے ایک دو کو یا آپ مر رہیں گے
پیارے تری گلی میں کچھ ہم بھی کر رہیں گے

مکدر کیوں نہ دل تیرا ہوا شک آہ سے میرے
لگے ہے زنگ لوہے کو ہوائے برشگالی سے

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

تنہا مرے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتی ہے سدا چاک گریبان سحر بھی

ہزار حرف شکایت پہ دیکھتے ہی تجھے
زباں پہ شکر ہو بے اختیار گزرے ہے

سب سے کہے سوتا ہوں یہ کہہ کر کہ پھر آنا	بالیں پہ مرے شورِ قیامت اگر آوے
زاہد چلا ہے کعبے کو اور برہمن کنشت	بندے ہیں اس کے ہم جو کسی دل میں گھر کرے
فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں	اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے
گر ہو شراب و خلوتِ محبوب خوب رو	زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

خواجہ میر دردؔ

وائے ناکامی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
میں اپنا دردِ دل چاہا کہوں جس پاس عالم میں	بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی تباہی کا
یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے	غم رہ گیا کبھو، کبھو آلام رہ گیا
سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما	اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے سامنے آیا	جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا	پر تیرے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور	شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کوئی نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن	میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پروبال نہ تھے آدم کے	وہاں پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا
دردؔ کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا	اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا
قتل سے میرے وہ جو باز آیا	کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
جوں چاہیے اس طرح بیاں ہم سے نہ ہوگا	کہہ اپنے دہن ہی سے تو وصف اپنی کمر کا
حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں ورنہ یہاں	اپنے اپنے بوریے پر جو گدا تھا شیر تھا
کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور	اے ستمگار خوش نہیں آتا

طوفان نوح نے تو ڈبوئی فقط زمیں	میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا
زلف میں دل کو تو الجھاتے ہو	اب اسے آپ ہی سلجھایئے گا
کہا میں نے ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے	لگا تب کہنے اب قندِ مکرر ہو نہیں سکتا
مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے	جی میں ہے خوب رویئے اب بیٹھ کر کہیں
آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بتنگ	آخر جیئے گا کب تلک اے خضر مر کہیں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو	دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
پھرتے تو ہو بنائے سج اپنی جدھر تدھر	لگ جائے دیکھیئے نہ کسی کی نظر کہیں
بعد مدت کے درد کل مجھ سے	مل گیا راہ میں وہ غنچہ دہن
مری اس کی جو لڑ گئیں نظریں	ہو گئے آنکھوں میں ہی دو دو سخن
باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں	گر یار ہیں تو ہم ہیں، اغیار ہیں تو ہم ہیں
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو	ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں
بتا وہ کون ہے جو تیری مجلس میں نہیں ہوتا	مگر یہ ایک ہم ہی ہیں جو نظروں میں کھٹکتے ہیں
اے ہجر کوئی شب نہیں جس کی سحر نہیں	پر صبح ہوتی آج تو آتی نظر نہیں
اس کی باتیں مجھ سے کیا پوچھو ہو تم	مدتیں گزریں کہ دیکھا بھی نہیں
آگے ہی بے سنے تو کہے ہے نہیں نہیں	تجھ سے ابھی تو ہم نے وہ باتیں کہی نہیں
سیر کر دنیا کی غافل، زندگانی پھر کہاں	زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں
وعدے تو میرے ساتھ کیے تو نے ہزاروں	پر ایک بھی اتنوں میں سرانجام کہیں ہو
جو کچھ بھی ہم نے کی ہے تمنا ملی مگر	یہ آرزو رہی ہے کوئی آرزو نہ ہو
میں نہیں کہتا کہیں تم اور مت جایا کرو	بندہ پرور اس طرف کو بھی کبھی آیا کرو
سناؤں کیسے اپنا حال اس کو سخت مشکل ہے	یہ قصہ جب لگوں کہنے تو اس کو نیند آتی ہے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

ہم کہتے نہ تھے درؔد میاں چھوڑ دو یہ باتیں
پائی نہ سزا اور وفا کیجئے اس سے

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اپنے دروازے تلک بھی وہ نہ آیا ایک بار
ہر گھڑی اٹھ اٹھ کے ہم جس کیلئے جایا کئے

تو چونکتا عبث ہے کسی بات کے لئے
میں آ گیا ہوں صرف ملاقات کے لئے

غم ناکیِ بیہودہ رونے کو ڈبوتی ہے
گر اشک بجا ٹپکے آنسو نہیں موتی ہے

دم لینے کی فرصت یاں تک دی نہ زمانے نے
ہم تجھ کو دکھا دیتے کچھ آہ بھی ہوتی ہے

محتاج اب نہیں ہم ناصح نصیحتوں کے
ساتھ اپنے سب وہ باتیں لیتی گئی جوانی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اطفائے نازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

جو ملنا ہے مل پھر کہاں زندگانی
کہاں میں، کہاں تو، کہاں نوجوانی

علاجِ دردِ سر صندل ہے لیکن
ہمیں گھسنا ہی اس کا دردِ سر ہے

مری سی نالہ تراشی نہ کر سکا فرہاد
اگرچہ اس نے بھی یک عمر تیشہ رانی کی

ہم اتنی عمر میں دنیا سے ہو گئے بیزار
عجب ہے خضر نے کیوں کر کہ زندگانی کی

بینائی نہ تھی تو دیکھتے تھے سب کچھ
جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

میر تقی میرؔ

مسجد میں امام آکے ہوا آج کہاں سے
کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے، ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں
جبہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

یاں کے سفید وسیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے تو ترے در پر مرا آسن جلا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ہم خستہ جی ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائیگاں میری

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور بھر تو دوا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

سرسری مت جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ

تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسی کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

شور کیا جو اسکی گلی میں رات کو میں سب جان گئے
آہ وفغاں کے طور سے میرے لوگ مجھے پہچان گئے

ہم سے تو جز مرگ کچھ تدبیر بن آئی نہیں
تم کہو کیا تم نے دردِ عشق کا درماں کیا

چڑھی تیوری کبھی اتری نہ اس کی غضب ہے قہر ہے پیارا ہمارا

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ مذہب عشق اختیار کیا

مکے گئے مدینے گئے کربلا گئے جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے

گو کہ آتش زباں تھا پہلے میرؔ اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

یارو مت اس کا فریبِ مہر کھاؤ میرؔ بھی تھا اس کے ہی یاروں کے بیچ

میرے سنگِ مزار پر فرہاد رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کے

ہم وہ ہیں جن کے خوں سے تری راہ سب ہے گل مت کر خراب ہم کو تو اوروں میں سان کے

حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے خوش وے جو اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک کر

یہ مشت خاک یعنی انسان ہی ہے روکش ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس ہائے افسوس صد ہزار افسوس

رخصتِ سیرِ باغ تک نہ ہوئی یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

کیا جانئے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے پوچھا نہیں ان نے تو ہمیں پیار سے اب تک

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آ جائیں گے شتاب روتے گذرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہ گیں نہیں اس غم کدے میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

مہمان میرؔ مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

نالہ مرا اگر سبب شور و شر نہ ہو پھر مر بھی جایئے تو کسی کو خبر نہ ہو

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں مانیں کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی، منہ کی زردی عشق کی کچھ تو علامت ہو

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ
ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

حالِ بدگفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کیا پہنچا نہیں سمعِ مبارک میں مرا حال
یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے

صبر بھی کریئے بلا پر میرؔ صاحب تم کبھی
جب نہ تب رونا ہی کڑھنا یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے ہاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں
اس عہد کو نہ جانئے اگلا سا عہد میرؔ
وہ دور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

دن ہیں بڑے کبھی کے راتیں بڑی کبھی کی
رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا ان نے سلوک کئے ہیں شہر کے عزت داروں سے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں — خوب رو کب کسی کی مانے ہیں
میں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں — پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن — وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور — اب مرے عہد کے فسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے — میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

کسکو دماغ رہا ہے یاں اب ضدیں اسکی اٹھانے کو — چار پہر جب منت کریئے تب وہ باتیں مانے دو

حرف غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے — جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے

تسبیحیں ٹوٹیں، خرقے، مصلے جلے پھٹے — کیا جانے خانقاہ میں کیا میرؔ کر گئے

کیا کیا ہوئے ہیں اہل زماں ڈھیر خاک کے — کیا کیا مکان دیکھتے ناگاہ ڈھے گئے

بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو — میرؔ ان لوگوں میں کس کا نام ہے

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمیں نپوائی

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا — سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

رحم کیا کر لطف کیا کر، پوچھ لیا کر آخر ہے — میرؔ اپنا، غم خوار اپنا، پھر یار اپنا، بیمار اپنا

یوں صبا بھی سبک نہیں جاتی — جوں گیا موسم شباب شتاب

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان — کم رہا موسم شباب بہت

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میرؔ — سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

یوں ناکام پھریں گے کب تک جی میں ہے اک کام کریں
رسوا ہوکر ماریں جاویں اس کو بھی بدنام کریں

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں — بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

دیکھیں دن کٹتے ہیں کیونکر راتیں کیسے گزرتی ہیں — بیتابی ہے زیادہ زیادہ صبر بہت کم کم ہے اب

بڑی دولت ہے درویشی جو ہمرہ ہو قناعت کے
کہ عرصہ تنگ ہے حرص و ہوا سے تاج داروں کا

آخر کو ہے خدا بھی، تو اے میاں جہاں میں
بندے کے کام کیا کچھ موقوف ہیں تمہیں پر

یاں شہرِ حسن میں تو کوئی ذکر ہی نہیں
کیا جانئے یہ مہر و وفا ہے کہاں کی بات

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت
دل لگا کے ہم تو پچھتائے بہت

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں
بہ خدا با خدا رہا ہوں میں

نہیں ملتا سخن اپنا کسی سے
ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

آدمی کو ملک سے کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

نہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں
تجھی سے اٹھیں میرؔ یہ خواریاں

جی میں آتا ہے کہ کچھ اور بھی موزوں کیجئے
دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

کہتے تو ہیں یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عزت بھی بعد ذلت بسیار چھیڑ ہے
مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا
تم نے ہمیشہ جور و ستم بے سبب کئے
اپنا ہی ظرف تھا کہ نہ پوچھا سبب ہے کیا
کیونکر تمہاری بات کرے کوئی اعتبار
ظاہر میں کیا کہو ہو سخن زیر لب ہے کیا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کل پاؤں اک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
ٹک میرؔ جگرِ سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تاکنا، جھانکنا کبھو نہ گیا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

گیا حسن خوبانِ بدراہ کا
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

آ گ تھے ابتدائے عشق میں ہم	اب جو ہیں خاک انتہا یہ ہے
لطف کیا ہر کسی کی چاہ کے ساتھ	چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ
بحر پر نہر پہ برسے ہے برابر ہی ابر	پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ
کعبہ سو بار وہ گیا تو کیا	جس نے اک بار دل میں راہ نہ کی
دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے	جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
تیزیوں ہی نہ تھی شب آتشِ شوق	تھی خبر گرم ان کے آنے کی
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ	افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی
حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ	خودسری، خودستائی، خودآرائی
پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں	اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے	اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے	جان ہے تو جہان ہے پیارے
میرے تغیر حال پر مت جا	اتفاقات ہیں زمانے کے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا	عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی	کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا	مستند ہے میرا فرمایا ہوا
ضبط کروں میں کب تک آہ	چل مرے خامے بسم اللہ
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز	تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ	پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا
داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوئے شوق	میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا
یہ توہّم کا کارخانہ ہے	یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے بغیر	ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد	کسی ویرانے میں بنایئے گا
شریفِ مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ	یہ میرؔ اب جو گدا ہے شراب خانے میں
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی	ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
سرسری تم جہان سے گذرے	ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
آخرکار جب جہاں سے گیا	ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
کل نہ آنے پہ ایک یاں تیرے	آج سو سو طرف گمان گیا
معالج کی نہیں تقصیر ہرگز	مرض ہی عاشقی کا لا دوا تھا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے	رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
زمین و آسمان زیر و زبر ہے	نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم	ہے خدا جانئے یہ کب کی بات
اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں	تم کس سمے کی کہتے ہو ہے یہ کہاں کی بات
مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب	تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت
اس غصیلے سے کیا کسی کی نبھے	مہربانی ہے کم عتاب بہت
میرؔ بندوں سے کام کب نکلا	مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ
شاہد لوں میرؔ کس کو اہلِ محلہ سے میں	محضر پہ خوں کے میرے سب کی گواہیاں ہیں
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے	اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو
پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ	ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہو
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں	تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
پوچھ مت عاشقوں کی معاش	روز ان کا بھی شام ہوتا ہے

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے مدعا ہم کو انتقام سے ہے

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے آسمان تک سیاہ کرتے تھے

آنے کے وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے اب آئے ہو تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

ان نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے تھے اڑ گئے آئینے کے طوطے سے

چپکے رہنا نہ میرؔ دل میں ٹھانو بولو، چالو، کہا ہمارا مانو
اک حرف نہ کہہ سکو گے وقتِ رفتن چلنے کو زبان کے غنیمت جانو

نظیرؔ اکبر آبادی

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست اللہ آبرو سے رکھے اور تن درست
یہ تن درستی یارو بڑی بادشاہی ہے سچ پوچھئے تو عین یہ فضلِ الٰہی ہے
گر دولتوں سے اس کا بھرا ہے تمام گھر بیمار ہے تو خاک سے بدتر ہے سارا زر
بیمار گرچہ لاکھ طرح سے ہو بادشاہ تو اس کو جانئے کہ گدا سے بھی ہے تباہ

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھنجھناہٹ، قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر پھسلا کوئی، کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر ہوتے ہیں سیکڑوں کے سر نیچے، پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
یہ رت وہ ہے کہ جس میں خورد و کبیر خوش ہیں ادنیٰ، وزیر، مفلس، شاہ و فقیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرم، عاشق اسیر خوش ہیں جتنے ہیں اس جہاں میں یارو نظیرؔ خوش ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا قہر ہے یارو جسے آ جائے بڑھاپا
اور عیش و جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا
ہر کام کو، ہر بات کو ترسائے بڑھاپا
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تھے گل بدن وہ اور یوسف ثانی
دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلوں کی نشانی
مر جائیں تو اب منہ میں نہ ڈالے کوئی پانی
کس دکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی
تھے جیسے جوانی میں پئے جام سبو کے
ویسے ہی بڑھاپے میں پئے گھونٹ لہو کے
تب آ کے گلے لگتے تھے محبوب بھبو کے
اب کہیے تو بڑھیا بھی کوئی منہ پہ نہ تھوکے

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

گھر بار روپیہ پیسے میں مت دل کو تم خرسند کرو
یا گور میں یا جنگل میں یا جمنا پر آنند کرو
موت آن لٹائے گی آخر کچھ مکر کرو یا خند کرو
بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ آن بجا چلنے کی فکر کرو

جہاں میں کیا کیا خرد کی اپنی ہر اک بجاتا ہے شادمانی
کوئی حکیم اور کوئی مہندس کوئی ہے پنڈت کتھا کہانی
کوئی ہے عاقل کوئی ہے جاہل کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

زمیں سے لیکر جو آسماں تک بھری ہے لاکھوں طرح کی خلقت
کہیں ہے ہاتھی کہیں ہے چیونٹی کہیں ہے رائی کہیں ہے پربت
یہ جتنے جلوہ دکھا رہے ہیں خدا کی صنعت خدا کی حکمت
جو چاہے کھولے یہ بھید اس کے کسی میں اسکی نہیں ہے قوت

پیسے ہی کا امیر کے دل میں خیال ہے — پیسے ہی کا فقیر بھی کرتا سوال ہے
پیسہ ہی فوج، پیسہ ہی جاہ وجلال ہے — پیسے ہی کا تمام یہ دنگ ودوال ہے
پیسہ ہی رنگ وروپ ہے پیسہ ہی مال ہے — پیسہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے

اب در پہ اپنے ہم کو رہنے دے یا اٹھادے — ہم ہر طرح سے خوش ہیں رکھ یا ہوا بتادے
عاشق یہ ہیں قلندر چاہے جہاں بٹھادے — یا عرش پہ چڑھادے یا خاک میں ملادے

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے — یاں یوں بھی واہ وا ہے اور دوں بھی واہ وا ہے

ٹک حرص وہوس کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا، بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر، کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جہاں ہے جب تلک یاں سیکڑوں شادی وغم ہونگے — ہزاروں عاشق جانباز اور لاکھوں صنم ہونگے
کنار و بوس اور عیش وطرب بھی دم بدم ہونگے — مگر جتنے یہ اپنی صف کے ہیں یہ سب عدم ہونگے
نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہونگے — میاں اکدن وہ آئیگا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس وگدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بےنوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اور ٹکڑے کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے پہ آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار — سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کا کاروبار

اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور فقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ

اور سب میں جو بڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

دیکھ تک غافل چمن کو گل فشانی پھر کہاں — یہ بہارِ عشق یہ شورِ جوانی پھر کہاں
ساقی و مطرب، شرابِ ارغوانی پھر کہاں — شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں
یہ جو کڑوے ہو کے ہمکو اب جھڑکتے ہیں یہاں — ان کی تلخی میں ہزاروں ہیں بھری شیرینیاں
اٹھ سکے جب تک اٹھا لے دل تو ان کی سختیاں — لذتیں جنت کے میووں کی بہت، یہ پھر کہاں

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں — پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں — سینہ اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں

جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود مسخرا
دیوار پھاند کوٹھا کوئی ہے اچھل گیا — ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم، ساقی اس سوا

سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے — یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے
وہ بولا سن کے بابا خدا تجھ کو خیر دے — ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیئے یہ ہے دل کا نور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب ہی دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر خواہش باغ و چمن نہ ہو
ہو کے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

کیا کیا فریب کھائے دنیا کی فطرتوں کا
مکر و دغا و دزدی ہے کام اکثروں کا
جب دوست بن کے لوٹیں اسباب مشفقوں کا
پھر کس زباں سے شکوہ اب کیجے دوستوں کا
ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے
آدمی، جن و پری، بھوت، بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش، باپ چچا راضی ہے
شاہ، مزدور، غنی، شاہ و گدا راضی ہے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر
جتنے ہیں سب کے دل میں بھری ہے ہوائے زر
آنکھوں میں دل میں جان میں سینے میں جائے زر
ہمکو بھی کچھ تلاش نہیں ہے سوائے زر

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مر گیا
دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مر گیا
عاقل تھا وہ جو آپ کو سمجھا کے مر گیا
بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مر گیا
دکھ پا کے مر گیا کوئی سکھ پا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا
کیا کالے پیلے شکل کے کیا گورے گل عذار
عاشق کوئی ہے اور کوئی معشوق طرح دار
عاقل حکیم و عامل و فاضل، رسالدار
پنڈت، نجومی، بید چہ ناداں چہ ہوشیار
دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مر گیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مر گیا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا نہ شام کرتا

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اسکے ہاتھ میں
چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا ادھر بڑھا لیا

دنیا میں آ کے ہم سے برا یا بھلا نظیر
جو کچھ کہ ہو سکا سو کیا پھر کسی کو کیا

میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج
وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اکھڑ گیا

دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے یہی آہ
پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا

لائے خاطر میں ہمارے دل کو وہ مغرور کیا
جس کے آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا، حور کیا

پہروں تلک میں کہتا ہوں حال اپنا پر مجھے
وہ اپنی ایک بات میں کرتا ہے لاجواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب
لیکن اسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب

آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت
اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

رہنے دو ہمیں کنجِ قفس میں کہ ہماری
قسمت میں یہی گوشۂ تنہائی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیرِ چمن کی
آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت

کی تم نے جفا ہم نے وفا جھوٹ ہے یا سچ
سوچو تو اسے دل میں ذرا جھوٹ ہے یا سچ

غصہ بھی کیا، دکھ بھی دیے تم نے و لیکن
چپ ہو رہے ہم سر کو جھکا جھوٹ ہے یا سچ

تم ہم سے کئی بار خفا ہو گئے اے جان
پر ہم نہ ہوئے تم سے خفا جھوٹ ہے یا سچ

جو تم نے کہا اس کے بجا لانے میں ہم نے
اک لحظہ توقف نہ کیا جھوٹ ہے یا سچ

جان و دل لائے ہیں ہم بھی نذر کو
گر قبول افتد زہے عز و شرف

منہ پر طمانچے، چھاتی پہ گھونسا، کمر پہ لات
کیا کیا ہوئیں ہیں مجھ پہ عنایا تیں ٹھیک ٹھیک

موقع سے بوسہ، موقع سے گالی بھی ہم کو دی
کی شوخ نے یہ دونوں مدارا تیں ٹھیک ٹھیک

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

رو آئینے کو دیتے ہو برعکس ہمارے
آئینہ رخو طالب دیدار تو ہم ہیں

گلشن میں عبث جاتے ہو کر حسن کی تزئین
اس جنس دل آرا کے خریدار تو ہم ہیں

گھڑی گھڑی ہمیں دیکھ اپنے در پہ کہتا ہے
یہ کون ہیں جو ادھر بار بار آتے ہیں

قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اسکے پاس
زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں

تھما نہ اشک، نہ نیند آئی، نہ پلک جھپکی
بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں

وہ منتظر کہ آویں، ہم منتظر کہ جاویں
اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں

اٹھنے میں، بیٹھنے میں، ہنسنے میں، بولنے میں
کچھ بے شعوریاں تھیں، کچھ ہوشیاریاں تھیں

تو جدھر چاہے ادھر جا کہ سحر سے تا شام
ہم بھی سائے کی طرح ہیں ترے ہمراہ میاں

ہم تری چاہ سے چاہیں گے اسے بھی دل سے
جس کو جی چاہے اسے شوق سے تو چاہ میاں

لیکن اتنا ہے کہ اس چاہ میں دریا ہیں کئی
ایسے ایسے کئی ہیں جن کی نہیں تھاہ میاں

آگے مختار ہو تم ہم جو تمہیں چاہے ہیں
اس سبب سے تمہیں کرتے ہیں ہم آگاہ میاں

ہنسے، روئے، پھرے، رسوا ہوئے، جاگے، بندھے، چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی
اک عالم تصویر ہے جس جس پہ نظر جائے

جاتی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر
گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی

ہے ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص
ہے سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی

میاں نظیر ہمیں چاہتے رہے سب کو
ہزار حیف کسی نے ہماری چاہ نہ کی

رہیں وہ لوگ جو بزم جہاں کی رونق ہیں
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغ مزار	ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے
منہ زرد، آہ سرد، لب خشک، چشم تر	سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہیں
میں ہوں اور مہ رو ہے او ساقی ہے اور بزم شراب گل فشانی، شادمانی، کامرانی، خرمی خواب کہیے اس تماشے کو نظیر اب یا خیال	پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب کچھ کہا جاتا نہیں واللہ علم بالصواب
ثروت و جاہ و جلال، حشمت و مال و منال قصر و محل دل پذیر زینت و زیب اے نظیر	کوئی اسے کچھ کہے، ہم تو سمجھتے ہیں خواب کوئی اسے کچھ کہے، ہم تو سمجھتے ہیں خواب
کیا روز تھے، کیا شور تھے، کیا عیش تھے، کیا لطف دکھلا کے جھمک جاتے رہے دم میں نظیر آہ	کیا ولولے، کیا قہقہے، بے خوف و خطر تھے کیا جانے وہ دن برق تھے یا مثلِ شرر تھے

غلام ہمدانی مصحفی

اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے	لیکن اک آشنا نہیں ملتا
ساقی شراب لایا، مطرب رباب لایا	مجھ پر تو اک قیامت عہد شباب لایا
تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے	غنچے نے طور مسکرانے کا
ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا	آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا
خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم	ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا
ترے در پہ اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا	کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
یہ عجیب رسم دیکھی کی بروز عید قرباں	وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا
منہ اٹھ گیا جدھر کو ادھر ہی چلے گئے	آوارگانِ عشق کو منزل کی کیا خبر

رو سیہ زلف کو کس طرح میں سمجھوں نہ رقیب	دیکھتا ہوں اسے ہر دم ترے رخسار کے پاس
زمانے کا چلن یکساں نہیں ہے	کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ ہے کہیں کچھ
نہ دوستی، نہ محبت، نہ دلبری دیکھی	جو دیکھی ہم نے تو اس سے ستم گری دیکھی
نہ انیس ہے نہ جلیس ہے، نہ شفیق ہے نہ رفیق ہے	ہم اکیلے گھر میں پڑے رہے سبھی لوگ گھر کے چلے گئے
نخوت سے کوئی جو پیش آیا	کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
دلی کہے ہیں جس کو زمانے میں مصحفی	ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے
لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے	کون سے شہر میں ہوتا ہے، کدھر ہوتا ہے
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم	تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

انشاء اللہ خان انشاء

بزمِ رندانہ میں کیا زہد و ورع کا چرچا	شیخ صاحب ہے، بہت یہ تو حماقت کی بحث
اب خیر و عافیت تو لگا مجھ سے پوچھنے	اتنا تو بارے نرم ہوا یار کا مزاج
کچھ تو دے اپنی نشانی مجھے بندا، بالا	توڑا، زنجیر، کڑا، قول کا چھلا، تعویذ
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر	فعلِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر
پر نہ تھے اس پر بھی پروانوں سے پہنچا کچھ پرے	کیا غضب ہوتا اگر پاتا کہیں انسان پر
کہاں تک کروں میں زمانے کا شکوہ	مصیبت ہے یوں تو سب اہل ہنر پر
سج گرم، نگہ گرم، ہنسی گرم، ادا گرم	وہ نام خدا سر سے ہیں تا ناخن پا گرم
روٹھنے میں بھی لطف ہے انشاء	صبح کو روٹھے وہ تو شام کو ہم
کاٹے ہیں ہم نے یونہی ایام زندگی کے	سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں
کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں	بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے ہمیں انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلاوے تو کیونکر نہ پیجئے
زاہد نہیں، میں شیخ نہیں، کچھ ولی نہیں

حیف ایام جوانی کے چلے جاتے ہیں
ہر گھڑی دن کی طرح ہم تو ڈھلے جاتے ہیں

جب تک کہ خوب واقفِ رازِ نہاں نہ ہوں
میں تو سخن میں عشق کے بولوں نہ ہاں نہ ہوں

نہ کچھ جہت، نہ سبب قاہ قاہ ہنستے ہو
تمہاری خوش مجھے آتی ہے قاہ قاہ نہیں

عوام الناس سے مت رکھ توقع آدمیت کی
کہ اکثر گرگ و روباہ و شغال و گربہ و سگ ہیں

کہہ بیٹھے صاف اس سے یہ دل جس سے وا نہ ہو
رے واوز بر روہوا ڑ نچھو ہو ہوا ہو

لیکے میں اوڑھوں، بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی، پھیکی، سوکھی ایسی مہربانی آپ کی

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ناسخ

نہیں ہے معتقد میرا اگر حاسد تو کیا غم
ہوا بے سجدۂ ابلیس کیا نقصان آدم کا

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیزو گر نہیں معراج ممکن عرش اعظم کا

سخاوت جس کو کہتے ہیں کہانی ہے زمانے کی
بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا

اس قدر روتے ہیں تیرے جور سے اہل جہاں
نام صفحے سے جہاں کے مٹ گیا چنگیز کا

کیا قوی ہے یہ دلیل اس کی پری زادی کی
ربط انسان سے کرتا جو وہ انساں ہوتا

اب تو باہر آ کہ ہم کب سے کھڑے ہیں منتظر
پیکر اپنا تیرے دروازے کا بازو ہو گیا

گل کو جب دیکھا تری تصویر کا دھوکہ ہوا
بولی جب بلبل تری تقریر کا دھوکا ہوا

اس رشکِ گل کے جاتے ہی بس آ گئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ گل کے چمن سے نکل گیا

ہے اس جہاں سے جدا ان دنوں جہاں اپنا
زمین سے ہے کہیں پست آسماں اپنا

طبعِ رنگیں ہے کافی اے ناسخ
شوق کب ہے لباسِ رنگیں کا

ہم خانہ خرابوں سے ملے کیا کوئی آ کر
دروازۂ افتادہ ہے دربان ہمارا

رہتا ہے ہمیں دھیان تمہارا ہی ہمیشہ
تم کو نہیں آتا ہے کبھی دھیان ہمارا

بہت پھولو نہ مسند پر ندیموں کی خوشامد سے
یہاں ملتا ہے عہدہ مدح خواں کو نوحہ خوانی کا

مر رہا تھا آپ میں ناحق ہوا بدنام تو
اونگھتے کو ٹھیلنے کا اک بہانا ہو گیا

زار اپنے جسم کو کمر یار نے کیا
خم دار ہم کو گیسوئے خم دار نے کیا

حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا

جانور اچھے کہیں ناسخ برے انسان سے
شہر سے وحشت ہوئی مانوس ویرانہ ہوا

حسنِ وحشت خیز ایسا ہے تو کیسے آدمی
اے پری ہر جن بھی کتا باولا ہو جائے گا

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا
جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

رات بھی دن ہے ہمیشہ پرتوِ رخسار سے
آ سکے تیری گلی میں کب ہے یارا شام کا

دیر کی آنے میں تم نے میں تڑپ کر مر گیا
صبحِ محشر پر گیا وعدہ تمہارا شام کا

ہے بھڑک جتنی زیادہ جلد ہے اتنا زوال
سب ستاروں سے ہے روشن تر ستارا صبح کا

ہو گئی آخر شبِ فرقت میں آخر زندگی
عہدِ پیری میں کیا آخر نظارہ صبح کا

ہجر میں لاغر بدن حد سے زیادہ ہو گیا
جو شلوکہ تھا ہمارا وہ لبادہ ہو گیا

ترک کر دوں میں جو نظارہ بتوں کا واعظا
کیا کئے پیدا خدا نے دیدۂ بینا عبث

کیا ہی منہ کرتا ہے تیڑھا دیکھتا ہے جب مجھے
کر دے یا رب روئے دشمن لقوے کا آزار کج

ہے کجی میں ہر نفس کج طبع جوں کتے کی دم
راست ان کو کیجئے سو بار، ہوں سو بار کج

جھانکنے کیلئے جس میں ہوں دراریں رخنے
اے پری رو ہے مجھے ایسی ہی دیوار پسند

جس سپاہی نے ترے ابروئے پرخم دیکھے
اس کو آئی نہیں کوئی کبھی تلوار پسند

زنجیر زلفِ یار کی تاثیر دیکھنا
دیوانے روز ہوتے ہیں دو چار دیکھ کر

کچھ تری بات کو ثبات نہیں
ایک ہاں ہے تو پانچ سات نہیں

ہاتھ اس کے چوم لیتا ہوں تو کیا کہتا ہے وہ
ہیں لکیریں یا کوئی لکھی ہے آیت ہاتھ میں

مر کے بھی چھٹتے نہیں آپ کی زلفوں کے اسیر
یہ عجب قید ہے جس کی کوئی معیاد نہیں

سالکوں کو کوئی آفت سدِ راہ ہوتی نہیں
مچھلیاں پھنستی نہ دیکھیں حلقۂ گرداب میں

میرے نالے سن کے آتا تھا کبھی دل میں جو رحم
روئی اب رکھنے لگا ہے وہ ستمگر کان میں

آپ اپنے عیب سے واقف نہیں ہوتا کوئی
جیسے بو اپنے دہن کی آتی ہے کم ناک میں

خواب میں سارے مزے وصل کے ہم لوٹتے ہیں
بند آنکھیں ہیں مگر بند کوئی کام نہیں

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں
رنج و حسد ہے جان ہے جبتک کہ جان میں

آسماں کی کب ہے طاقت جو چھڑائے لکھنو
لکھنو مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنو

میں جاں بلب ہوں گلا کاٹو یا گلے سے لگو
جو اس میں آپ کو منظور ہو وہ جھٹ پٹ ہو

رنگ بدلا ہے زمانے نے عجب کیا ہے اگر
مشک ہو جائے سفید اور ہو کافور سیاہ

جب نہ تب کہتے ہو صاحب صبر کر
بندہ عاشق ہے کہ وہ ایوب ہے

کر یہی ادنیٰ و اعلیٰ پر قیاس
نہریں شیریں ہیں سمندر شور ہے

ساقی چڑھا گیا تو ہوں جام شراب عشق
پر سوجھتی نہیں کوئی تدبیر اتار کی

تو وہ شیریں ہے کہ تجھ پر ہوئی شیریں فرہاد
تو وہ لیلیٰ ہے کہ تجھ پر ہوئی مجنوں لیلیٰ

وہ بگڑا ہوا منہ بناتے نہیں اب
مرا کام بگڑا بنا چاہتا ہے

لاکھوں ہی نامور ہوئے دنیا میں بے نشاں
اک گور میں ہیں کتنے سکندر بھرے ہوئے

بازیچۂ جہاں کو تو شطرنج ہی سمجھ
خالی ہیں کوئی دم میں دلا گھر بھرے ہوئے

رہتا ہے خوابِ نازنیں پڑھتا نہیں کبھی
تکیوں میں نامے ہیں عوضِ پر بھرے ہوئے

یار کو خط لکھنے بیٹھا میں تو دفتر ہو گیا
شوق کہتا ہے کہ اور اک بند جوڑا چاہیے

خاکساری بھی نہ چھوڑے دے خدا جسکو عروج
آسماں پر ماہ تاباں ہے زمین پر چاندنی

دل سیہ ہے بال سب اپنے ہیں پیری میں سفید
گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی

ہو گیا ہے دل مرا مردہ کہاں فکرِ سخن
شعر خوانی کے عوض اب نوحہ خوانی چاہیے

ہو چکا ہوں پیر اب حوروں سے ہونگے رابطے
ان پری زادوں کی الفت کو جوانی چاہیے

چمکی چمک رہی ہے زیادہ ستاروں سے
پاپوش میں لگا دی کرن آفتاب کی

جس کو تاکا بچ گیا چوکے جسے مارا اسے
تم کو تیر اندازی آتی ہے نئے انداز کی

کہہ موذن سے پڑھے آ کے جنازے کی نماز
میرے پہلو سے جو تو سن کے اذاں اٹھتا ہے

لڑتے ہیں پریوں سے کشتی پہلوانِ عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیے

گرچہ اے جان نہیں تیری کوئی بات بری
پر مری بات نہ مانی ہے یہی بات بری

گو کبھی جاڑا، کبھی گرمی، کبھی برسات ہے
ہجر میں بارہ مہینے اپنی اک اوقات ہے

ذوق

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہی میں گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل
ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو خود ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ واژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوقؔ
نامرد مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

آدمیت کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

اے ذوقؔ تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے ہیں وہ جو تکلف نہیں کرتے

کر دیا موت نے لاچار و گرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ سا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

قسمت سے ہی ناچار ہوں ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

آخر گل اپنی صرفِ درِ مے کدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

سبزہ خط اے خضرِ طریقت رکھتا رسم الخط ہے جدا
خطِ بتاں ہے خطِ الٰہی لکھے موسیٰ پڑھے خدا

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں اک خامشی تری سب کے جواب میں

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کے ہاتھ اٹھا
اے ذوقؔ یہ اٹھا نہ سکے گا کھکھیڑ تو

موت ہی اب کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہو گر پست قامت ہو تو ہو

بجا کہیے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حق نے تجھکو اک زباں دی اور دیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے اک اور سنے انسان دو

کہے ایک جب سن لے انسان دو
کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کم ان سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ وکعبہ لکھا کرتا تھا القاب مجھے

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اے ذوقؔ دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم تو نہ ہوں گے
ہم ہونگے وہ نہ ہونگے، وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے گا تو آن کے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

غالبؔ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے رخ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو مگر
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہے عاشق کا گریباں ہونا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غضب کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی نادان کی جی کا زیاں ہو جائے گا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے	صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے	بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں	ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے	کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے	یا بیاں کی بے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں	لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم	سر جائے یار ہے نہ رہیں پر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو	بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات	سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض	ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ	ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ	لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر	دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے	رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت میں ملیں گے	کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں	تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ	واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

لکھنو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوں گئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں
نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے لئے کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
نہ لُٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہ زن کو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ہوکر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پاؤں

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ / شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ / ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں / اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی / اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

موت کا ایک دن معین ہے / نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید / جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ / کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے / اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں / ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی / سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو / میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی / مطرب بہ نغمہ رہ زنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ / یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی / اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں / غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے / نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو صنوبر / تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر / کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ / طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب / اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر | کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے | جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق | وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے | کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن | دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق | نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا | گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

پرہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا | اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف | آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے | تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل | جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا | وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو | ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم | دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا | ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

منحصر مرنے پر ہو جس کی امید | ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہو خوب رویوں کو اسدؔ | آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا | لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے | تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے | ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

پھر دیکھیئے اندازِ گل افشانیِ گفتار | رکھ دے کوئی پیانہ وصہبا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے | رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ | خدا سے کیا ستمِ جورو نا خدا کہیے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ | کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے | اب کسے رہ نما کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے | بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن | بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے | ہوئی صبح اور گھر سے کان پر دھر کر قلم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی | وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے
کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ | پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے | ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو | کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں | کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب | آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر | کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے | شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن | بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے | بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل | کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

میر انیسؔ

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منتِ خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

قناعت و گہرِ آبرو و دولتِ دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے

ایک کشکولِ توکل ایک نقدِ جاں ہے پاس
ہیں غنی دل کے کوئی دام و درم رکھتے نہیں

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

زور سے اس کے لیا ہے ہم نے میدانِ سخن
اور نیزہ ہاتھ میں غیر از قلم رکھتے نہیں

یہ دوات و خامہ ہیں ملکِ فصاحت کا نشاں
کون کہتا ہے کہ ہم طبل و علم رکھتے نہیں

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

گھٹا زور مشقِ سخن بڑھ گئی
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک

انیسؔ یہ ہوا حالِ جوانی و پیری
بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

حکیم مومن خاں مومنؔ

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موئے
اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

آپ کی کون سی بڑھی عزت
میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دیر و کعبہ یکساں ہیں عاشقوں کو اے مومنؔ
ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

وحشت سے تیری سارے احبا چلے گئے
آنا ہے تو آ جاؤ کہ خالی مکاں ہے اب

سجدے میں سر قلم ہو دعا پر زباں کٹے
گویا نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں ہے اب

چل دیے سوئے حرم کوئے بتاں سے مومنؔ
جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

میرے مرنے پہ بھی وہ خوش نہ ہوا
جی گیا یوں ہی رائیگاں افسوس

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو
کہ دے پٹکے زمیں پر آسماں کو

مومن نہ توڑ رشتۂ زنارِ برہمن
مت کرو وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی	آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن	آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
اف ری گرمیِ محبت کہ ترے سوختہ جاں	جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے	تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا	ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

امیر مینائی

فریاد بھی کرتا ہوں تو اللہ سے اپنے	اس در کے سوا میں کہیں سائل نہیں ہوتا
جس بزم میں وہ رخ سے اٹھا دیتے ہیں پردہ	پروانہ وہاں شمع پہ مائل نہیں ہوتا
برہمن کو بت، مجھے تو اے صنم	جس نے جو مانگا خدا سے، مل گیا
مرگ کے بعد ہے بیدار دلوں کو آرام	نیند بھر کر وہی سوئے گا جو جاگا ہوگا
بے سبب زلزلہ عالم میں نہیں آتا ہے	کوئی بے تاب تہہ خاک تڑپتا ہوگا
جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور	جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آ گیا
اک پری رو نے ہماری یہ بنائی درگت	سیکڑوں پریوں میں کیا حالِ سلیماں ہوگا

اپنے مرنے کا تو کچھ غم نہیں غم یہ ہے امیرؔ	چارہ گر مفت میں بے چارہ پشیماں ہوگا
کہیں تو دیکھ چکا ہوں یقین ہے دل کو	مگر یہ یاد نہیں ہے تمہیں کہاں دیکھا
کیا جانئے کیا ہے ترے بیمار کی حالت	عیسیٰ بھی یہ کہتے ہیں کہ ہے وقت دعا کا
جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکوؤں سے بھرا	تم گلے سے کیا ملے سارا گلہ جاتا رہا
پرسش کو مری کون مرے گھر نہیں آتا	تیور نہیں آتے ہیں کہ چکر نہیں آتا
گھر میں تمہارے غیر سے جایا نہ جائے گا	آغوش نور میں کبھی سایہ نہ جائے گا
مجھ کو ہو تیرا تصور، تجھ کو ہو میرا خیال	میں تری تصویر کھینچوں تو مری تصویر کھینچ
تعریف دوستوں کی نہیں معتبر امیرؔ	اچھا ہے وہ کلام کرے جو عدو پسند
اے ابر کرم کچھ تو برسنے میں کر کمی	ہے کاروبار خلقِ خدا کا تمام بند
تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر	سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
ہیں جو آنکھیں طالب دیدارِ یار	کاش ہوتیں روزنِ دیوارِ یار
زندہ مردہ، مردے زندہ ہو گئے	حشر برپا کر چلی رفتارِ یار
اٹھاتے تھے جو قرآن کل تلک پرہیزگاری پر	مصلے تک گرو ہیں آج ان کی بادہ خواری پر
کروں میں عذرخواہی دل جو کافر کا بھی ہو میلا	جو ٹوٹے ہاتھ سے بت گر پڑوں پائے برہمن پر
میں وہ افسردہ دل ہوں سرد ہو ہنگامۂ آتش	مری صورت جو کوئی کھینچ دے دیوار گلشن پر
ہو خاک جاہلوں کو ہمارے سخن کی قدر	پتھر کو لعل ہے نہ صدف کو گہر عزیز
جھوٹوں نہ پھر کسی نے کیا یاد ایک دن	کیا ہم کو دفن کر کے ہوئے بے خبر عزیز
دیکھئے جس کو وہ ہے حسن میں یکتائے جہاں	لب، دہن، چشم، مژہ، زلف، معنبر، عارض
اس کو دیکھا تو کیا ہم نے تماشائے چمن	زلف سنبل ہے، دہن غنچہ، گلِ تر عارض
غل ہوا شہر میں خورشید گہن میں آیا	چھپ گیا جب تہِ گیسوئے معنبر عارض

ہم کو وزیر سے نہ کسی شاہ سے غرض
اللہ کے فقیر ہیں اللہ سے غرض

اٹھوایئے نہ میرے جنازے کو دھوم سے
مرنے کے بعد کیا حشم و جاہ سے غرض

نشاں ملتا نہیں ان کے مکاں کا
لئے پھرتا ہے قاصد جا بجا خط

شعراء اٹھ گئے دنیا سے مگر دیکھ امیؔر
اچھے شعروں کا زمانہ ہے ثنا خواں اب تک

ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں
اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں

ناز، ادا، آن، حیا، غمزہ، کرشمہ، شوخی
لے گیا دل کو اڑا کر کوئی ان ساتوں میں

سوزِ فرقت ، دردِ دل ، زخمِ جگر ، ناسورِ چشم
کچھ نہ پوچھو مبتلا میں کتنے آزاروں میں ہوں

پھول میں پھولوں میں ہوں کانٹا ہوں کانٹوں میں امیؔر
یار میں یاروں میں ہوں عیار عیاروں میں ہوں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیؔر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں

امیؔر وصل میں اس شوخ نے تلون سے
ہزار بار کہی ہاں، ہزار بار نہیں

رہ روِ راہِ عشق ہوں جز درد
کوئی توشہ میری کمر میں نہیں

مانگنا ہو جو مانگ لے اس سے
کون سی شئے خدا کے گھر میں نہیں

کس گل کا سوئے گورِ غریباں گزر ہوا
پھولے نہیں سماتے ہیں مردے مزار میں

دنیا ہی میں جو بات کوئی پوچھتا نہیں
روزِ حساب آئیں گے ہم کس شمار میں

اپنی محفل سے اٹھاتے ہیں عبث ہم کو حضور
چپکے بیٹھے ہیں الگ آپ کا کیا لیتے ہیں

یہاں کمالِ تواضع وہاں کمالِ غرور
ادھر ہیں سجدے پہ سجدے ادھر سلام نہیں

گرہ سے کچھ نہیں جاتا ہے پی بھی لے زاہد
ملے جو مفت تو قاضی کو بھی حرام نہیں

جو مے کشی سے ہو فرصت تو دو گھڑی کو چلو
امیؔر مسجد جامع میں آج امام نہیں

محفل میں شمع، باغ میں شبنم، فلک پہ ابر
کس کی ہے آنکھ جو مرے ماتم میں تر نہیں

کہتے ہیں بے وفائی کا رونا نہ رو یہاں
سارے جہان میں ہے یہی کچھ یہیں نہیں

یا ہم ہی ہم تھے کوئی نہ تھا ان کی بزم میں
یا اک جہان آج وہاں ہے ہمیں نہیں

عالم سے ان کی انجمنِ ناز ہے الگ
چھت جس کی آسمان ہے یہ وہ زمیں نہیں

مریضِ عشق سے پہلو تہی طرفہ تماشا ہے
ہوئے بیمار تو ہم اور پرہیز آپ کرتے ہیں

مرا خط پھینک کر قاصد کے منہ پر طنز سے بولے
خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں

گھر سے ہم نکلے تھے مسجد کی طرف جانے کو
رند بہکا کے ہمیں لے گیا میخانے کو

تم ہو، خنجر ہے، میں ہوں قتل کرو
کس کا اب انتظار کرتے ہو

وصل کیونکر ہو دونوں قیدی ہیں
ہم نقاہت کے وہ نزاکت کے

خاک میں مجھ کو ملا کر بھی ہوئے صاف نہ وہ
مٹ گیا میں نہ مٹی ہائے کدورت میری

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصے پر پیار آتا ہے

دن مرا روتا ہے میری رات کو
رات روتی ہے مری دن کے لئے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا
ہم برے سب سے ہوئے جن کے لئے

مرگِ عاشق کی خبر آئی تو جھنجلا کے کہا
روز سو مرتے ہیں کب تک کوئی ماتم میں رہے

ہو دردِ عشق ایک جگہ تو دوا کروں
دل میں جگر میں سینے میں، پہلو میں، سر میں ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مری تپش سے مرے دل کی بے قراری سے
تمام خلق ہے واقف تمہیں خبر نہ سہی

امیؔر اک تختۂ ہموار ہے یہ شعر کا کوچہ
طبائع کے تفاوت سے بلندی اور پستی ہے

ہم مر بھی گئے مر کے ہوئے خاک بھی لیکن
ظالم یہی کہتا ہے وفا اور ہی کچھ ہے

آخر ہوئے نہ حضرتِ دل آپ واں ذلیل
ہاں اور دوڑ دوڑ کے مہمان جایئے

مانی ہیں، میں نے سیکڑوں باتیں تمام عمر
آج آپ ایک بات مری مان جایئے

کہتے ہیں آ کے در پہ مرے پایئے گا کیا
یاں خاک چھاننی ہو اگر چھان جایئے

یہ رشک بد بلا ہے دمِ رخصتِ حبیب
کیونکر کہوں خدا ہے نگہبان جایئے

جان سی چیز دی نہیں جاتی
پر کروں کیا تمہاری خاطر ہے

قتل میں کس لئے ہے اب تاخیر
آپ موجود بندہ حاضر ہے

نہیں جب دل سے نکلی پھر کہاں ہاں
خدا محفوظ رکھے اس نہیں سے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وہ صورت نہ آنکھوں میں ہے اب نہ دل میں
مکیں سے ہیں خالی مکاں کیسے کیسے

خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا
تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

پتہ ایک نے بھی نہ منزل کا پایا
بھٹکتے پھرے کارواں کیسے کیسے

زمینِ سخن پر ہیں لاکھوں سخن ور
چمن ایک ہے باغباں کیسے کیسے

آنکھیں دکھلاتے ہو.. بن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

دخترِ رز گھر میں جو قاضی کے ہے اسکی کیا بات
پارسا گھر ہے، رقم چوکھی ہے، مال اچھا ہے

غم میں گزرے تو برا، عیش میں گذرے تو بھلا
نہ برا کوئی ہے دنیا میں نہ سال اچھا ہے

کل نظر آئے تھے جاتے ہوئے مسجد کو امیؔر
آج دیکھا تو چلے آتے ہیں مے خانے سے

زیست کا لطف تو یاروں ہی کے دم تک ہے امیؔر
بیٹھ جاتا ہے دل احباب کے اٹھ جانے سے

فسانہ رہ گیا حسن و محبت کا زمانے میں
نہ مجنوں ہے، نہ لیلیٰ ہے، نہ ناقہ ہے، نہ محمل ہے

امیرؔ خستہ جاں کی مشکلیں آسان ہوں یارب
تجھے ہر بات آساں ہے، اسے ہر بات مشکل ہے

تو آسمان توڑ چکا اب بہت نہ بڑھ
اے نالہ آگے جائے ادب ہے خدا سے ڈر

اب نہیں دو شعر بھی یاد اے امیرؔ
تھے کبھی دیوان کے دیوان حفظ

وفا کا وعدہ وفا ہو یہ غیر ممکن ہے
جفا کا وعدہ تو اب تک وفا ہوا ہی نہیں

راحت کو ڈھونڈتا ہے عبث تو جہان میں
اس کا زمیں میں ہے نہ پتا آسمان میں

دیکھتی ہیں جب اسے آنکھیں تو کہتا ہے یہ دل
دیکھئے یہ دیکھنا کیا کیا دکھاتا ہے مجھے

کانٹوں میں ہے وہ پھول ستاروں میں چاند ہے
ذروں میں وہ خورشید ہے، قطروں میں گہر ہے

زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

خواجہ حیدر علی آتشؔ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

ٹھیک آئی اپنے تن پہ قبائے برہنگی
باقی لباس چھوٹے ہوئے یا بڑے ہوئے

کون سے دن نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

کشتہ ہم بھی تری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

ایک شب بلبل بے تاب کے جاگے نہ نصیب
پہلوئے گل میں کبھی خار نے سونے نہ دیا

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

اس قدر اہلِ جہاں کو ہے محبت زر کی	پیٹ میں مارتے سونے کا جو خنجر ہوتا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے	ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب	زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا
دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر	دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
طبل وعلم ہے پاس نہ اپنے نہ ملک ومال	ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
کہوں کیا ہوئی عمر کیونکر بسر	میں جاگا کیا بخت سویا کیا
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا	کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
کیا جگہ کوچۂ محبوب ہے سبحان اللہ	کوئی کعبہ، کوئی جنت، کوئی گلشن سمجھا
کس درجے تنگ ہوں ترے ہاتھوں سے اے جنوں	لاؤں کہاں سے روز گریباں نئے نئے
مسافر ہی نظر آیا جو دنیا میں	جسے دیکھا اسے آلودۂ گردِ سفر دیکھا
امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک	نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا
کون عالم میں ہے ایسا جو نہیں سربسجود	کس کی گردن کو جھکاتا نہیں احساں تیرا
اک دن حضورِ قلب سے ہوتی نہیں ادا	زاہد تری نماز کو میرا اسلام ہے
وفا سرشت ہوں شیوہ ہے دوستی میرا	نہ کی وہ بات جو دشمن کو ناگوار ہوئی
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں	شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا
تقریر اپنی اور روش یار کی ہے خوب دو چار روز لالہ وگل کی بہار ہے	گفتار پر ہمیں اسے رفتار پر گھمنڈ کیجے قبا پہ اور نہ دستار پر گھمنڈ
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے	میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا	کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا
جو بھی لکھا خوب لکھا دسترس ہوتا اگر	چومتا میں ہاتھ اپنے کاتبِ تقدیر کا

جسے میں نیک سمجھتا تھا مجھ سے بد ظن تھا
یقینِ خضر تھا جس پہ مجھے وہ رہ زن تھا

کون وارفتہ نہیں تیری طرفداری کا
حوصلہ سب کو ہے یوسف کی خریداری کا

خضر سے راہِ وطن کیا سمجھ کے پوچھوں میں
مجھے تو خود یہ غریب الوطن نظر آیا

محبتِ مے و معشوق ترک کر آتش
سفید بال ہوئے موسمِ خضاب آیا

فکرِ بلند نے مری ایسا کیا بلند
آتش زمینِ شعر سے پست آسماں ہوا

راہ دے صورتِ موسیٰ ہمیں بحرِ ہستی
کشتی و پل سے نہ ہووے گا گزارہ اپنا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

نہ پاک ہوگا کبھی حسن و عشق کا جھگڑا
یہ قصہ وہ ہے کہ جس کا کوئی گواہ نہیں

مرے دل کو شوق فغاں نہیں مرے لب تک آئی دعا نہیں
وہ ذہن ہوں جسمیں زباں نہیں وہ جرس ہوں جسمیں صدا نہیں

تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی روبرو برسوں

ہوا مہمان آ کر رات بھر وہ شمع رو برسوں
رہا روشن مرے گھر کا چراغِ آرزو برسوں

تنگ دستی نے زمانے میں یہ پایا ہے رواج
یوسف اس عہد میں تکتا ہے خریدار کی راہ

دل کہیں، جان کہیں، چشم کہیں، گوش کہیں
اپنے مجموعے کا ہر ایک ورق برہم ہے

دیکھا مشیر کار نہ دیوانہ کا کوئی
اس بادشاہ کو نہیں حاجت وزیر کی

آ نکلے کدھر سے ہیں کہاں یاں سے جائیں گے
اول کی کچھ خبر ہے نہ ہم کو اخیر کی

چھوٹ کر عشق کے پھندے سے ہیں تنگ اے آتش
ہم کو آزادی سے بہتر وہ گرفتاری تھی

بد سرشتوں پہ نہ نیکوں کا اثر ہو ہرگز
صحبتِ گل سے نہ ہو دیں کبھی خوشبو کانٹے

چلی ہے ایسی زمانے میں کچھ ہوا الٹی
کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا الٹی

نگاہ یار کے پھرتے ہی ہم سے اے آتش
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے چلئے سدھاریے

غیرِ رسوائی کبھی ان سے نہ کچھ حاصل ہوا
عشق سے نفرت ہے تجھ کو حسن سے پرہیز ہے

منزلِ مقصود تک اللہ پہنچائے ہمیں
وقتِ شب ہے، ابر ہے، صحرائے آفت خیز ہے

ہجر کی شب میں کہانی سے کہیں آتی ہے نیند
قصہ خواں کے بدلے یاں یٰسین خواں درکار ہے

سنا ہے قصۂ مجنوں و وامق و فراہاد
کسی کو عاشقی آتش نہ سازگار ہوئی

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ہر شب شب برات ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

اور کوئی طلب ابنائے زمانے سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

تصویر کھینچی اس کے رخِ سرخ فام کی
اک صفحہ میں قلم نے گلستاں تمام کی

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

چپ ہو کیوں کچھ منہ سے فرماؤ خدا کے واسطے
آدمی سے بت نہ بن جاؤ خدا کے واسطے

ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے ہیں قدم
گر بھی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

بس قلم صفحہ ہستی سے اٹھا اے آتش
ڈھل چکے شعر جو تھے فکر میں ڈھلنے والے

داغ دہلوی

مجھے آباد کرتا ہے مجھے برباد کرتا ہے
خدایا دین و دنیا میں کرم تیرا، ستم تیرا

جب داغ کو ڈھونڈا کسی بت خانے میں پایا
گھر میں کبھی اس مردِ خدا کو نہیں دیکھا

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح
یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

کی ترک مے تو مائلِ پندار ہو گیا
میں توبہ کر کے اور گنہ گار ہو گیا

کس کس کی چاہ کیجئے کس کس کی آرزو
اک دل ہزار غم میں گرفتار ہو گیا

میں نے تو اپنے واسطے کی تھی دعائے وصل
الٹا اثر ہوا وہ رقیبوں سے مل گیا

خدا جب دوست ہے اے داغ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

چلنا ہمارے ساتھ ذرا اے شبِ فراق
دوزخ میں قحط ہو نہ عذابِ شدید کا

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی
دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

وہی ہم تھے کہ جو روتوں کو ہنسا دیتے تھے
اب یہ ہے حال کہ تھمتا نہیں آنسو اپنا

کبھی مجلس میں جو وہ شوخ پری زاد آیا
پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا

اپنے سینے سے دبا دیجے ذرا سینہ مرا
چور کیجے شیشۂ دل کو اسی پتھر سے آپ

شام سے صبح تک وصال کے لطف
صبح سے شام تک جمال کے لطف

میرا طریقِ عشق جدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہگذر کو میں

ملاتے ہو اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

اے داغ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی
کوئی کھنچا کھنچے، کوئی ہم سے ملا ملے

دنیا کی چھیڑ چھاڑ سے اب تک نہیں نجات
الجھا ہوا ہوں حشر کے دن بھی حساب میں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

ہر چند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں

وہ کاش وصل کے انکار ہی پہ قائم ہوں
مگر انہیں تو کسی بات پر قیام نہیں

اے فلک چاہیئے جی بھر کے نظارہ ہم کو
جا کے آنا نہیں دنیا میں دوبارہ ہم کو

انہیں گو رنجشِ بیجا ہے لیکن ہے تو ہم سے ہے
محبت گر نہ ہو باہم شکایت درمیاں کیوں ہو

بتوں کے کوچے سے ہم دل فگار ہو کے چلے
شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد
کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

آئینہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر
آنکھ جس جانب تمہاری اٹھ گئی

بعد محشر کیا یہ بت بے کار ہی رہ جائیں گے
اک نہ اک فتنہ ہے لازم ہر زمانے کے لئے

عشق کی راہ میں جب کافر دیں دار آئے
سب کے سب داغ رہ دیر و حرم بھول گئے

بہم دشمن بھی یکجا ہوں تو الفت ہو ہی جاتی ہے
یہ ہے مل بیٹھنا ایسا محبت ہو ہی جاتی ہے

سنتے ہیں خوشی بھی ہے زمانے میں کوئی چیز
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں کدھر ہے یہ کہاں ہے

بس ناک میں دم ہے دل دشوار طلب سے
وہ کام بگڑتا ہے جو مشکل نہیں ہوتا

کیا غضب ہے نہیں انسان کو انساں کی قدر
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

اس بت کی محبت میں قیامت کا مزہ ہے
کافر کو بھی دوزخ میں پشیماں نہیں دیکھا
ہر چند ترے ظلم کی کچھ حد نہیں ظالم
پر ہم نے کسی شخص کو نالاں نہیں دیکھا

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

ہمیشہ تم کو مبارک ہو داغ روزِ نشاط
پھریں ہمارے بھی جیسے پھرے تمہارے دن

ہائے وہ دل وہ کلیجہ میں کہاں سے لاؤں
وصل میں شاد نہ ہو ہجر میں ناشاد نہ ہو

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے
نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لیکر دیکھو	اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی
نہ ملے گا وہ جستجو سے کہیں	خلق کس دردِ سر میں پھرتی ہے
پندِ واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے	کیا عبادت کو ہمیں ہیں سب فرشتے مر گئے
ہائے مجبوریاں محبت کی	حال کہنا پڑا ہے دشمن سے
فتنہ، فساد، رشک، تغافل، غرور، ناز	اس کے سوا ہے اور تری انجمن میں کیا
تمہیں فکر کیوں، رنج کیوں، لاگ کیوں ہے	کسی سے اگر واسطہ ہے کسی کا
اے کاش میرے تیرے لئے کل یہ حکم ہو	لے جاؤ ان کو خلد میں جو کچھ ہوا ہوا
اس پہ مرتے ہیں جو بے درد ہو بے مہر بھی ہو	عشق ہے سارے زمانے سے نرالا اپنا
رہتا نہیں ہے اپنا مقدر بھی اپنے ساتھ میں ہر طرح سے موردِ الزام ہو گیا	وہ بھی شریکِ گردشِ ایام ہو گیا تقصیر کی کسی نے مرا نام ہو گیا
یہ حوروں پہ مرتا ہے بے دیکھے بھالے	نہیں کوئی عاشق مسلماں سے بڑھ کر
نہ آیا ہے نہ آئے ان کے وعدے کا یقیں برسوں	یونہی ہے آج کل پرسوں مگر ملتے نہیں برسوں
جل کے ٹھنڈے ہوئے ترے غم میں	ہم کو جنت ملی جہنم میں
کچھ ترا شوق کچھ تری حسرت	اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں
رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے	اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں
سب لوگ جدھر وہ ہیں ادھر دیکھ رہے ہیں	ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں	ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمہیں	یہ ہمارے سامنے کی بات ہے
واقعی ہم نے تیرے کوچے میں	داغ کو گاہ گاہ دیکھا ہے
میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے	جب کوئی بلانے نہیں آتا، نہیں جاتا

ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش
معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم

دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

ناز ہو، انداز ہو، خوش خو ہو، خوش اخلاق ہو
کیا کریں ہم لےکے معشوقوں کی خالی صورتیں

جائے گا عذر آپ کا کہ نہیں
اس نہیں کی بھی ہے دوا کہ نہیں

عشق حصہ ہے ہمارا اسے تم جانتے ہو
حسن بخشا ہے خدا نے تمہیں ہم جانتے ہیں

کس کی طاقت ہے کرے کوئی برائی آپ کی
ساری دنیا آپ کی، ساری خدائی آپ کی

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ سے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

میں نے تو اپنے واسطے کی تھی دعائے وصل
الٹا اثر ہوا وہ رقیبوں سے مل گیا

نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

فلک نے کینہ کیا، تو نے ستم، میں نے وفا
وہی ازل میں ملا جس کو جو پسند ہوا

وفا نہیں نہ سہی، شیوۂ جفا ہی سہی
پسند آپ کی جو آپ کو پسند ہوا

مری زباں نہ تھکی رات کٹ گئی ساری
کھلا جو شکووں کا دفتر تو پھر نہ بند ہوا

آپ کی برہم مزاجی کا ٹھکانا ہی نہیں
یہ تو مجھ کم بخت کا حالِ پریشاں ہو گیا

کیونکر اب اس نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ تاکید کہ پینا ہوگا

تیرا دو روز کا وعدہ بھی نہیں حشر سے کم
ایک اک دن مجھے ایک اک مہینہ ہوگا

چین دیتے نہیں وہ داغ کسی طرح مجھے
میں جو مرتا ہوں تو کہتے ہیں کہ جینا ہوگا

ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

وہی ہم تھے کہ جو روتوں کو ہنسا دیتے تھے
اب یہ ہے حال کہ تھمتا نہیں آنسو اپنا

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا

ذبح کرتے ہی مجھے قاتل نے دھوئے اپنے ہاتھ
اور خون آلودہ خنجر غیر کے گھر رکھ دیا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہو کچھ کام کا نہیں — الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ہوش و حواس تاب و تواں جا چکے ہیں داغ — اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

کبھی مجلس میں جو وہ شوخ پری زاد آیا — پھر نہ اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا

دی موذن نے شب وصل اذان پچھلی رات — ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

لیجئے سنئے اب افسانہ فرقت مجھ سے — آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

رکاوٹ نہ ہوتی تو دل ایک ہوتا — ہمارا، تمہارا، تمہارا، ہمارا

برائی جو کی تم نے غیروں کی ہم سے — ہوا حال سب آشکار اتمہارا

نکل کر مرے گھر سے یہ جان لو تم — نہ ہوگا کسی گھر گزارا تمہارا

ہم کسی کام میں تقدیر کے قائل ہی نہ تھے — کچھ نہ بن آئی تو کہتے ہیں مقدر اپنا

ان کا یہی سنا ہے کہ وہ کچھ نہیں سنتے — میرا یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یہ خوب سمجھ لیجئے غماز وہی ہے — جو آپ سے کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

برسوں آنکھوں میں رہے آنکھوں سے پھر کر دل میں آئے — راہ سیدھی تھی مگر پہنچے بہت چکر سے آپ

حضرتِ زاہد نکل آیا فلک پر آفتاب — پیر و مرشد اب تو اٹھئے میکدے کے در سے آپ

رغبت ہے عشق میں اسے آب و طعام سے — آنسو عزیز، زہر گوارا، لہو پسند

جھکی ذرا چشمِ جنگجو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی

بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے، جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

تری محبت نے مار ڈالا ہزار ایذا سے مجھ کو ظالم

رلا رلا کر، گھلا گھلا کر، جلا جلا کر، مٹا مٹا کر

فتنہ پرداز، دغاباز، فسوں گر، عیار — ہائے افسوس دل آیا بھی تو آیا کس پر

وہی قاتل، وہی مخبر ہے، وہی منصف بھی
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

فریاد نالہ، شور وفغاں، شیون، اشک، آہ
ساتوں فلک بھی کرتے ہیں ان ساتوں کا لحاظ

کس کا یقین کیجئے، کس کا یقیں نہ کیجئے
لاتے ہیں اس کی بزم سے، یار خبر الگ الگ

مجھ سا نہ دے زمانے کو پروردگار دل
آشفتہ دل، فریفتہ دل، بے قرار دل

پڑھی نماز جنازے کی میرے قاتل نے
گناہ کر کے ہوا ہے ثواب میں داخل

اے داغ جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

تمہاری بدمزاجی سے ہمیں کیونکر نہ خوف آئے
مثل مشہور ہے صاحب بڑے سے سب ہی ڈرتے ہیں

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

نالے کرتے دل ناکام برے ہوتے ہیں
کہ برے کام کے انجام برے ہوتے ہیں

اس کا کوچہ ہے کہ ہے عرصۂ محشر یارب
سیکڑوں طالب دیدار چلے جاتے ہیں

شوخی نے تری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدے میں، صنم خانقاہ میں

ظالم وقاتل وسفاک وغضب ناک ہو تم
عاشق وشیفتہ ووالہ وشیدا ہوں میں

داغ کیا پوچھتے ہو میں نہیں کچھ کہہ سکتا
خیر جس حال میں ہوں شکر ہے اچھا ہوں میں

داغ اب یوسف کہاں، لیلیٰ کہاں، شیریں کہاں
جو حسیں شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہوگئیں

دن ڈھلے آنے کا وعدہ ہے کسی کا لیکن
آج کا دن وہ قیامت ہے کہ ڈھلتا ہی نہیں

وعدۂ حشر آپ کرتے ہیں
چار دن بعد یہ شباب کہاں

پڑا فلک کو بھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے راکھ نہ کردوں تو داغ نام نہیں

کعبہ ودیر میں جو داغ نہیں
پھر یہ ہے خانماں خراب کہاں

مہر ووفا وراحت وآرام کو رقیب
جور وجفا وکاوش وخون جگر کو میں

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

سنائے جاتے ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو
جو میں کہوں تو کہے آپ سے کلام نہیں

خبر سن کر مرے مرنے کی بولے وہ رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

کوئی جانے تو کیا جانے وہ یکتا ہے ہزاروں میں
ستمگاروں میں، عیاروں میں، دلداروں میں، یاروں میں

حضرتِ داغؔ یہ ہے کوچۂ قاتل اٹھئے
جس جگہ بیٹھتے ہیں آپ تو جم جاتے ہیں

فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

خط ان کا بہت خوب عبارت بہت اچھی
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

بہکتے نہ تھے داغؔ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ

کوچۂ یار کہیں چھٹتا ہے
میں نہ ہوں گا مری تربت ہوگی

بزم میں آپ بھی ہیں دوست بھی ہیں دشمن بھی
امتحان آج جو ہونا ہے ہمارا ہو جائے

نالوں سے مرے دیکھئے اب آئی قیامت
چھیڑا تھا کے آپ بھی کیا یاد کریں گے

اٹھ گئی یوں وفا زمانے سے
کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

کیا پوچھتے ہو داغؔ کا تم ہم سے ٹھکانا
آوارہ و سرگشتہ ہے کیا جانے کہاں ہے

اے فلک سامانِ محشر ہی نہیں
اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے
ہر طرف ہے تیرے بیماروں کا شور
ہر گلی میں اک مسیحا چاہیے

کیا تلون مزاج ہوائے داغؔ
چار دن بھی کہیں بسر نہ ہوئی

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
کبھی چلنا، کبھی رکنا، کبھی ملنا، کبھی کھنچنا
ترے خنجر کو ہر انداز معشوقانہ آتا ہے
دغا، شوخی، شرارت، بے حیائی، فتنہ پردازی
تجھے کچھ اور بھی اے نرگسِ مستانہ آتا ہے

رہے برہم ہی تری زلفِ پریشاں کی طرح
کام بگڑے ہوئے ہر چند سنوارے ہم نے

مجنوں کا حال سن کے پریشان ہو گئے
میری اگر سنو گے تو اوسان جائیں گے

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
اور ہونگے تری محفل سے ابھرنے والے

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

نہ سمجھا عمر گزری اس بتِ خودسر کو سمجھاتے
پگھل کر موم ہو جاتا اگر پتھر کو سمجھاتے

کیا کہیے کس طرح سے جوانی گزر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

اس بت کے ہمیں نہیں ہیں بندے
مخلوق غلام ہو گئی ہے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آئے ہیں وہ رقیب کے گھر سے
اک خوشی ہے تو ایک ماتم ہے

اک جہاں مہرباں ہوا تو کیا
مہربانی تری مقدم ہے

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

میر مہدی مجروح

کہتے ہیں دردِ عشق سے کیوں مر گئے نہ تم
لو اور سنئے یہ بھی ہمارا قصور تھا

اعدا کا گھر سمجھ کے مرے گھر وہ آ گئے
جاگے نصیب یوں کہ نشے میں وہ چور تھا

کچھ عرضِ تمنا میں، شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا، اور آپ نے کیا جانا

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو کہو خیر تو ہے
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

خوار، رسوا، ذلیل، سودائی
مل چکے ہیں ہمیں خطاب بہت

میری تصویر دیکھ کر بولے
ہے یہ کس سوگوار کی صورت

نکالے جاؤ گے اس گھر سے مجروحؔ
نہ چھوڑی گر وہاں جانے کی عادت

صاف دل سے کبھی نہ مل بیٹھے
ان میں ہم میں رہی سدا کھٹ پٹ

میری میت سے ہٹ کے یوں بولے
یہ بلا ہے کہیں نہ جائے لپٹ

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے
سارے جھگڑے نبیڑ لے جھٹ پٹ

کچھ ہو مجروحؔ گھس چلو گھر میں
آج در اس کا ہے کھلا چوپٹ

ٹکٹکی در سے ہو لگائے ہوئے
سچ کہو کس کا انتظار ہے آج

نہ رہی فکر آب و دانہ کی
قید نے ہم کو کر دیا آزاد

زغن و زاغ کی آواز سے ہے حشر بپا
خوب آباد ہوا گھر مرا ویراں ہو کر

وہ تو آئے ہیں یہ ہے رنجشِ بے جا ہر دم
اور دشوار ہوا کام یہ آساں ہو کر

سامنے آنے لگے نامہ و پیغامِ عدو
اور آفت میں پڑے ان کے نگہباں ہو کر

اس جہاں میں نہیں جز رنج مآلِ شادی
گرتے ہیں خاک پہ گل شاخ پہ خنداں ہو کر

شیر کے سامنے جاؤ مگر اس سے بھاگو
خصلتیں رکھے جو حیوان کی انساں ہو کر

دردِ سر ہیں تمام عقل کے ساتھ
جو کہ بے خود ہے، ہے وہی ہشیار

عشق ہے ایک مگر آفتِ نو ہے ہر دم
یہ وہ مضموں ہے کہ ہوگا نہ پرانا ہرگز

جنسِ نایاب کے ہوتے ہیں ہزاروں گاہک
تم پتا اپنا کسی کو نہ بتانا ہرگز

جو چلا تیرِ ستم دل سے وہ گذرا اے چرخ
اس کا خالی نہ گیا کوئی نشانہ ہرگز

دل میں ہیں حسرت و انبوہ کے انبار لگے
اتنا یکجا نہ کہیں ہوگا خزانہ ہرگز

تھے جو مسجد میں شیخ صدر نشیں
وہ ہیں مے خانے میں پڑے بے ہوش

کیا ضعف نے یوں نکما کہ اب ہم
نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل

واں حسن کا غرور ہے یاں فرطِ شوق ہے
ان کو ہماری اور ہمیں ان کی خبر نہیں

روز ملنے میں ہے وہ بات کہاں
لطف جو وصلِ گاہ گاہ میں ہے

مہر و قہر ان کا کچھ نہیں کھلتا
ہم تو مدت سے اشتباہ میں ہیں

مل جائے تو ہے شکر نہ مل جائے تو ہے صبر
ہوں راہ روِ مسلکِ تسلیم و رضا میں

اس کی شوخی کی ہے کوئی حد بھی
اک نہ آنے کے سو بہانے ہیں

الم و درد و رنج، بے تابی
یار اپنے یہی پرانے ہیں

میں کروں جستجو کہاں جا کر
ان کے تو سو جگہ ٹھکانے ہیں

میں تو بدنام ہوں و لے صاحب
تم بھی کچھ ایسے نیک نام نہیں

حال ابتر مریضِ غم کا ہے
صبح گر بچ گیا تو شام نہیں

غضب میں، قہر میں، جور و جفا میں
مزہ ملتا ہے ان کی ہر ادا میں

کھلے بالوں سے کب بچتا ہے کوئی
غضب کا جال پھیلائے ہوئے ہیں

وہ سمائے ہوئے ہیں نظروں میں
اپنی آنکھوں میں جائے خواب نہیں

کج ادائی یہ سب ہمیں تک تھی
اب زمانے کو انقلاب کہاں

صوفی نہ خانقاہ میں، نہ رند دیر میں
مجمع ہے اک جہاں کا تری جلوہ گاہ میں

کل تقدس مآب مسجد تھے
آج رندوں میں آئے بیٹھے ہیں

تم ان کے دینے میں اتنا دریغ کرتے ہو
یہ گالیاں کوئی منصب نہیں، خطاب نہیں

دلربائی کون سکھلائے تمہیں
تم تو ان باتوں کے خود استاد ہو

ہمیں شکوہ ہے اک بے دادگر کا
اب اس میں آپ ہوں یا آسماں ہو

کبھی ان کا تھا آسماں پر دماغ
یہ مجروحؔ پھرتے ہیں جو خوار سے

سوائے شر نہیں کچھ اور دیکھا
خدا محفوظ رکھے اس بشر سے

پسِ مردن ملے گا خاک آرام
زمیں کے نیچے بھی تو آسماں ہے

اٹھے وہ تو اک حشر برپا کیا
جو بیٹھے تو فتنے اٹھانے لگے

چشم سے افزوں ہے غمزے کا ستم
بڑھ گیا شاگرد یہ استاد سے

واں ستم تک دریغ ہے ہم سے
یاں توقع میں ہیں عنایت کے

کچھ نہ کچھ لائے ہم اس محفل سے ہیں
خالی ہاتھ آنے کی حسرت ہی سہی

وہ بھی شاید کہ بتقریب عیادت آئیں
ہم تو برسوں اسی امید میں بیمار رہے

دامِ صیاد میں پھنسے جا کر
ہم نکلتے ہی آشیانے سے

کل تھے مجروحؔ واعظِ مسجد
آج نکلے شراب خانے سے

قتل کو میرے آگئے بارے
یہ تو وعدہ وفا کیا تو نے

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

مجھ میں تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھ دی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
ہے اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

حالیؔ نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

جہاں میں حالیؔ کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اسکا چرچا نہ کیجئے گا

آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی ہے

انکے غصے میں ہے دل سوزی، ملامت میں ہے پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

غرورِ فخر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سوا سب بے خبر

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تا کہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں وہ
گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

تذکرہ دلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

آگے بڑھے نہ قصہ عشقِ بتاں ہم سے
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں ہم سے

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا ان کو
دربدر جھانکتے پھرنے سے انہیں عار نہیں

بوالہوس، کام طلب، بندہ نفس، اہلِ ہوا
ایک عالم ہے اسی رنگ میں دو چار نہیں
وعدۂ عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلف علامت ہے بے گانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

اکبر الٰہ آبادی

وہ بھی چپ بیٹھے ہیں اغیار بھی چپ، میں بھی خموش
ایسی صحبت سے طبیعت مری گھبراتی ہے

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام	وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
سیّد اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے	شیخ قرآن دکھاتا پھرا پیسہ نہ ملا
افلاک تو اس عہد میں ثابت ہوئے معدوم	اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک
کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ	آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک
شیخ کو وجد میں لاتی ہیں پیانو کی دھنیں	پیچ دستارِ فضیلت کے کھلے جاتے ہیں
بہت رہا ہے کبھی لطفِ یار ہم پر بھی	گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں	فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
پیدا زیادہ سب سے دلیلیں ہمیں نے کیں	اور شبے میں بھی سب سے زیادہ ہمیں رہے
کرتے تمام عمر چناں اور چنیں رہے	آخر میں کی نظر تو جہاں تھے وہیں رہے
مجھ کو راس آئی ہے مستی شیخ جی کو فربہی	میں ہوں پینے کیلئے اور وہ ہیں کھانے کیلئے
صحبتِ باہم میں تو اب روز رہتا ہے فساد	ہم سے ان سے دور کی صاحب سلامت خوب تھی
کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہ حب قومی میں	وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا
سب ہو چلے ہیں اس بت کافر ادا کے ساتھ	رہ جائیں گے رسول ہی بس اب خدا کیساتھ
بارِ خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد برا	دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی
سدھاریں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دیکھیں گے	وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود	کسے خبر ہے کہ مقصود زندگی کیا ہے
ہم تو انساں سے ہوئے جاتے ہیں بندر اے حضور	آپ خوش قسمت تھے جو بندر سے انساں ہو گئے
اپنی مرضی کے مطابق دہر کو کیونکر کروں	بے حد آتا ہے مجھے غصہ مگر کس پر کروں
جیسا موسم ہو مطابق اس کے میں دیوانہ ہوں	مارچ میں بلبل ہوں تو جولائی میں پروانہ ہوں
زندگی سے میرا بھائی سیر ہے	پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

اسلام کے دعوے سے میں باز آتا ہوں صاحب
یہ کون بتائے تمہیں اللہ کہاں ہے

مجھ میں اظہارِ محبت ان میں اظہارِ کمال
میں وہاں رونے گیا اور وہ کہیں گانے گئے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جائیں ہمکولوگ
اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اس قدر جانے گئے

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جوان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال
بیج مغرب نے جو بویا وہ اگا اور پھل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا
ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ساتھ ان کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا
بندر کی طرح اونٹ اچھل ہی نہیں سکتا

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں
موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں

ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتی ہیں حمد اور بھجن دونوں

مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی
تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد و مٹن دونوں

انہیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی
نکلتی ہیں دعائیں انکے منہ سے ٹھمریاں ہو کر

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی

اجل آئی اکبرؔ گیا وقت بحث
اب اِف کیجئے اور نہ بٹ کیجئے

کہاں کا حرام اور کیسا حلال
جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجئے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے
اونٹ کا لیکن کرایا کون دے

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے
کونسل میں بہت سیّد مسجد میں فقط جمن

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

اغیار تو واقف ہوئے رگ رگ سے ہماری
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس بت کی کمر بھی

مکے تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے
اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

کچھ الٰہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے فقط اکبر کے اور امرود کے

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے میں نے جس کو زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے بی اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

تعجب ہے مجھے ان شاعروں کے شوروغوغا پر
کوئی پوچھے کہ تم کو کیا جو کوئی خوبصورت ہے

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

خطا معاف مروں گا میں حور ہی کے لئے
مسیں بھی خوب ہیں لیکن حضور ہی کے لئے

خالی حرم کو شیخ ہی تنہا نہ کر گئے
حیرت میں بت بھی ہیں کہ برہمن کدھر گئے

دیوانوں سے شعر جتنے سب کا خلاصہ مجھ سے سنئے	آپ کی صورت ماشاء اللہ میری نیت توبہ توبہ
پستیِ قوم کے دن آگئے جب اے اکبر	اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر	خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں
جس نے دیکھا ہو گیا عاشق	واہ رے صورت واہ رے خالق
شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلٰی باقی	اور مرے پاس ہے اردوئے معلٰی باقی
دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے	زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے
چپکوں دنیا سے کس طرح میں	عورت نے کہا کہ گوندھوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں	کالج نے کہا کہ توندھوں میں
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو	طول شب فراق ذرا ناپ دیجئے
شیخ سے چھوٹے الجھے انجن میں	اس میں بک بک تھی اس میں بھک بھک ہے
ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی	مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنہ حالؔی سنو	با ہنر ہو کر جو چمکو قوم سے گالی سنو
ہم کو پیر طریقت نے یہی دی ہے صلاح	قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سنو
طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی	دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی
ہم ریش دکھاتے ہیں اسلام کو دیکھو	مس زلف دکھاتی ہیں کہ اس لام کو دیکھو
پھنسایا تو آنکھوں نے دام بلا میں	مگر عشق میں ہو گیا نام دل کا
تمہارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرت واعظ	اثر لیکن نگاہِ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا
لب و چشمِ صنم گر دیکھنے پاتے کہیں شاعر	کوئی شیریں سخن ہوتا کوئی جادو رقم ہوتا
حسن کے واسطے لازم ہے تلون شاید	دیکھئے روز بدلتی ہے قمر کی صورت
بعد مدت کے جو تقریر بھی کی تم نے تو وہ	جس کا مطلب نہیں معنیٰ نہیں مفہوم نہیں

ادھر ہم سے باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
ادھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

جفائیں جھیل کر تاثیر الفت کی دکھاتے ہیں
حنا کیطرح پس لیتے ہیں تب ہم رنگ لاتے ہیں

نگاہِ قہر سے دیکھا یہی غنیمت ہے
مجھے تو آپ سے امید اس قدر بھی نہ تھی

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

یہ ہے کہ جھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن
سن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بڑھ کر

سن لے جو توجہ سے بزرگوں کی نصیحت
پھر کانِ جواہر نہیں اس کان سے بہتر

مجھی سے سب یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

مجالِ گفتگو کس کو ہے ان کے حسن کے آگے
زبانیں بند کر دیں ان بتوں نے بے زباں ہو کر

نگاہیں مل گئی تھیں میری انکی رات محفل میں
یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

پیش کر دینا شکایت کا تو کچھ مشکل نہیں
لیکن ان کو رنج ہوگا مجھ کو کچھ حاصل نہیں

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں
تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہم سن کر نہیں سکتیں

عوض قرآں کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

خیر خواہ آج زمانے میں کہاں ملتے ہیں
ہے یہی لاکھ غنیمت کوئی بد خواہ نہ ہو

کفر کی رغبت بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی
کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذ اللہ بھی

اب تو نقدی سے کوئی صاحب مرادل خوش کریں
سن چکا ہوں مرحبا بھی، آفریں بھی، واہ بھی

واہ کیا جلوہ ہے پیشِ چشمِ ادراکِ بشر
شبہ بھی، ہاں بھی، نہیں بھی، وہم بھی، واللہ بھی

مولوی صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

قوم کی تاریخ سے جو بے خبر ہو جائے گا
رفتہ رفتہ آدمیت کھو کے خر ہو جائے گا

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شئے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں ہرگز
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

لذت چاہو تو وصلِ معشوق کہاں
شوکت چاہو تو زر کا صندوق کہاں
کہتا ہے یہ دل کہ خودکشی کی ٹھہرے
خیر اس کو بھی مان لیں تو بندوق کہاں

بہتر ہے کہ ہو صبر کی قوت میں ترقی
ان پر اثرِ آہ و فغاں ہو نہیں سکتا

جو دل میں آتی ہے اے واعظو نہیں رکتی
سکوت خوب ہے لیکن تمہیں نے کیوں نہ کیا

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی
موت کو روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پر
خیریت گزری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

یہ طرز احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

مدتوں سے ٹالتے ہیں آج کل پر وہ مجھے
صبح کو اقرارِ شام اور شام کو اقرارِ صبح

مجال کیا کوئی کہہ دے خوشامدی مجھ کو
اسی سبب سے بہت سہل ہے جناب کی مدح

خدا سے مانگ اگر مانگنا ہے اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

کیا ذوق عبادت ہو ان کو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں
حلوائے بہشتی ایک طرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام
اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

عاقبت کا اب خیال آنے لگا
شورشِ عہدِ جوانی ہو چکی

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے
خدا باہر ہے حدِ دوربیں سے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت
کبوتر اڑ گئے انجن کی پیں سے

یہ دنیا رنج و راحت کا فقط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گزرتی ہے

حکم انگلش کا ملک ہندو کا
اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

یہ نہ پوچھو مجھ سے یہ کیا اور ایسا کیوں نہیں
شیخ یہ سوچو تمہارے پاس پیسہ کیوں نہیں

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو

پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں ریشے کو کیا کریں
مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں

فرہاد سے کہا کہ مناسب ہے تجھ کو صبر
کہنے لگا بتایئے تیشے کو کیا کریں

آپس میں رہنا صلح سے خوئے بنی آدم نہیں
اکثر اسی پر ہے عمل یا تم نہیں یا ہم نہیں

ٹھیک پڑھ سکتا نہیں کہتا ہے ناموزوں مجھے
خود زبان معترض ہی خارج از تقطیع ہے

کام کوئی نہیں باقی مجھے مرنے کے سوا
کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی نہ کرنے کے سوا

علامہ اقبال

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مصرع بلند ہے

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت سے شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

وطن کی فکر کرناداں مصیبت آنے والی ہے	تری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو	تمہاری داستاں تک نہ ہو گی داستانوں میں
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا	چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ	ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو	یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے	کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل	لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا بہت	بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی
زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا	سکوت تھا پردہ دار جسکا وہ راز اب آشکار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنی خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی	جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں	یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے	جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز	نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے	تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا	کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں	موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا	ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں	محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا	آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے	پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کافر ہے تو تقدیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

آئینِ جواں مردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

میں جانتا ہوں انجام اسکا
جس معرکے میں ملّا ہو غازی

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات

خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے	پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے	یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے	ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا	لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے	صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں	مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ
تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا	کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے	اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت	ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے	ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے	مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم	رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے	اے مردِ خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت	یہ چار عناصر ہو تو بنتا ہے مسلماں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم	دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا	اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد
خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے	کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
مجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو	کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں
وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ	اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

جوش ملیح آبادی

دشمن بھی جس کو دیکھ کے دل میں اداس ہیں
اس طرح دوستوں کے ستائے ہوئے ہیں ہم
جس کو اس آسمان پر رکھ دیں تو چیخ اٹھے
شانوں پہ وہ پہاڑ اٹھائے ہوئے ہیں ہم
یہ بھی عجب طلسم ہے اے دورِ زندگی
اپنوں کی انجمن میں پرائے ہوئے ہیں ہم

کل گلستاں تھا، گلابی تھی، صنم تھے، ساز تھا
آج اگر کچھ ہے تو لے دے کر خدا کا نام ہے

سو بات کی اک بات ہے اس بات کو مانو
جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہوئے کوئی ابھرتا ہی نہیں
جو بات پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں

سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا
جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

آسودہ جو دھارے ہیں وہ طوفاں نہیں بنتے
جو موت سے ڈرتے ہیں وہ انساں نہیں بنتے

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پہ تبسم نہیں آتا
گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اس شخص کا ساحل پہ سفینہ نہیں آتا
شیروں کی طرح جن سے ڈکارا نہیں جاتا
عزت کی طرف ان کو پکارا نہیں جاتا
مے خانۂ اکرام میں پینے نہیں دیتی
دنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

جب تلک رشوت نہ لیں ہم دال گل سکتی نہیں
ناؤ تنخواہوں کے پانی میں تو چل سکتی نہیں

سچ بتاؤں زیب یہ دیتا نہیں سرکار کو
پالیے بیماریوں کو، ماریئے بیمار کو

علتِ رشوت کو اس دنیا سے رخصت کیجئے
ورنہ رشوت کی دھڑلے سے اجازت دیجئے

کوڑھیوں پر آستیں کب سے چڑھائے ہیں حضور
کوڑھ کو لیکن کلیجے سے لگائے ہیں حضور

جس کو انسان تو کیا دیو بمشکل سمجھیں
زیرِ مشق اب ہے وہ اندازِ بیاں ساقی
جن کو سنتے ہیں تو کانوں سے ٹپکتا ہے لہو
اب ان الفاظ کے خنجر ہیں رواں اے ساقی

ہر آن آہ سرد سے ہو جس کا سابقہ
موج صبا سے وجد میں آئے تو کس طرح
جس پر کثافتیں ہوں غم روزگار کی
دریا لطافتوں کے بہائے تو کس طرح
دنیا میں جس کا نوحہ بھی سنتا نہ ہو کوئی
وہ بدنصیب شعر سنائے تو کس طرح

پیسہ اگر نہیں تو رذالا ہے آدمی
مفلس ہے تو گدھے کا بھی سالا ہے آدمی
انسان وہ کلی ہے جو اب تک کھلی نہیں
وہ شاخ ہے صبا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے یہ وہ جو ابھی تک سلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اس کو ملی نہیں
جو آج تک ہے بند وہ تالا ہے آدمی
مفلس ہے تو گدھے کا بھی سالا ہے آدمی

کچھ لذتِ بحث جس کی صحبت میں نہیں
باتوں میں مزہ اس کی رفاقت میں نہیں
جو مختلف الخیال مجلس میں ہے لطف
وہ متحد الرائے جماعت میں نہیں

ہر خوف کو زیر و پست کر کے نکلو
ہر نیست کو گھر سے ہست کر کے نکلو
نکلو جو پئے شکار مرغ و ماہی
تو شیر کا بندوبست کر کے نکلو

مخلص نہ سہی ظلم کا بانی تو نہ بن
شمشیرِ عناد کی روانی تو نہ بن
کرتا نہیں احسان کا اقرار نہ کر
محسن کا مگر دشمن جانی تو نہ بن

اک جنس کا میلان ہے اور کچھ بھی نہیں
اک جسم کا ہیجان ہے اور کچھ بھی نہیں

اے مردِ خدا روح کو کیا عشق سے کام
یہ خون کا ارمان ہے اور کچھ بھی نہیں

سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہے
جاگے ہوئے ذہنوں کو سلا دیتی ہے
جس قوم کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
وہ عقل سے عشق کو بڑھا دیتی ہے

اے آسمان تیرے خدا کا نہیں ہے خوف
ڈرتے ہیں اے زمین ترے آدمی سے ہم

دل کی بستی کچھ ایسی بستی ہے
صبح ہوتی نہیں طلوعِ جہاں

لاکھوں میں بے نظیر کروڑوں میں فرد ہے
جو مسکرائے طیش میں بے شک وہ مرد ہے

جھکتا ہے فتنہ عفو و ترحم کے سامنے
گھٹتا ہے طعنہ حسنِ تکلم کے سامنے
تھمتا ہے شورِ جنگ ترنم کے سامنے
تلوار کانپتی ہے تبسم کے سامنے

بدلے کی رسم دینِ وفا میں حرام ہے
احسان اک شریف ترین انتقام ہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

سوچ کر غم دیجئے ایسا نہ ہو
آپ کو کرنی پڑی غم خواریاں
اک طرف جنسِ وفا قیمت طلب
اک طرف میں اور مری ناداریاں

رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے
دیوانگی ہے عقل نہیں ہے کہ خام ہو
دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیے

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں
کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں
میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی
یہ جنت ہے تو ہائے دنیائے فانی
نصیحت سے روکا بہت ناصحوں کو
کسی نے ہماری نصیحت نہ مانی
حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی
نہ اردو، نہ ہندی، نہ ہندوستانی

نہ دلدہی، نہ تسلی، نہ وعدہ ہے نہ وفا
تمہیں کہو تمہیں کس دل سے کوئی پیار کرے

فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار
یہ جس کے پاس نہ ہو صبر اختیار کرے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

ہے ازل کی اس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے، زندگی فانی مجھے

کہیں زیر دستوں کو راحت نہیں ہے
نہ زیر فلک ہے نہ زیر زمیں ہے

شوکت علی خان فانیؔ بدایونی

ہاں آپ کسی کو یوں برباد نہیں کرتے
یہ فانیؔ ناکارہ سچ ہے اسی قابل تھا

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں
اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا

ہر شاخ، ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ، ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
آسماں سے ہو چکا ساری بلاؤں کا نزول
جس پہ آتی تھی بلائیں وہ مرا غم خانہ تھا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

دوسرا نام ہے شب فرقت
میری تقدیر کی سیاہی کا

موت آنے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

یاد ہے فانیؔ تجھے کوئی کہانی اور بھی
ختم کر افسانۂ غم، دل پریشاں ہو گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی	وجود درد مسلّم علاج نامعلوم
ضبط کی کوششیں بھی ہیں جاری	درد بھی کر رہا ہے اپنا کام
دلربا، دلبر و دلدار و دل آرا تم ہو	عاشق و والہ و دلدادہ و شیدا میں ہوں
خود مسیحا، خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں	زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں
ناخوش گوار ہے جو محبت کا تذکرہ	اچھا تو آؤ اور کوئی گفتگو کریں
عادت ہے التجا و دعا کی و گرنہ میں	کیا جانتا نہیں کہ وہ کافر خدا نہیں
وہ مرے قتل کا فرمان سہی	کچھ وہ ارشاد تو فرماتے ہیں

جگر مرادآبادی

ہم نہ مرتے ترے تغافل سے	پرسشِ بے حساب نے مار ڈالا
تیرا ملنا ترا نہیں ملنا	اور جنت ہے کیا جہنم کیا
محبت کیلئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں	یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا
اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل	ہم وہ نہیں ہیں جن کو زمانہ بنا گیا
صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ	حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی
گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انسان	بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے
کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا	دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا
اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں	درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا
جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر	عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا
وصل سے شاد کیا، ہجر سے ناشاد کیا	اس نے جس طرح سے چاہا مجھے برباد کیا
دل ہمارا ہے یا تمہارا ہے	ہم سے یہ فیصلہ نہیں ہوتا

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب | آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ وگل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصلِ بہار پر

اپنے حدود سے نہ بڑھے کوئی عشق میں | جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

اک لفظ محبت کا اک ادنیٰ فسانہ ہے | سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے | ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے | اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن | بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے سو دانہ ہے

علم کے جہل سے بہتر ہے کہیں جہل کا علم | میرے دل نے یہ دیا درسِ بصیرت مجھ کو

پیراہن جنوں سے تن عشق ڈھک لیا | یہ اک طریقہ خاص ہے اخفائے راز کا

ورنہ کیا تھا صرف ترتیبِ عناصر کے سوا | خاص کچھ بے تابیوں کا نام انساں ہو گیا

اس نے جو آگ لگا دی وہ فروزاں ہی رہی | بجھ گئی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی

جب دیکھ نہ سکتے تھے تو دریا بھی تھا قطرہ | جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا

مرا ان کا بننا بگڑنا ہی کیا | نگاہیں ملیں اور حجاب آ گیا
اداؤں میں شوخی جھلکنے لگی | قیامت کو لے کر شباب آ گیا
جگر یہ قیامت کی بے ہوشیاں | اٹھو سر پہ اب آفتاب آ گیا

قہر کی لاکھ نگاہوں کی ضرورت کیا ہے | لطف کی اک نگہ ناز نہ جینے دے گی

حدودِ کوچہ محبوب ہے وہیں سے شروع | جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے

خدا جانے محبت کون سی منزل کو کہتے ہیں | نہ جس کی ابتدا ہی ہے نہ جس کی انتہا ہی ہے

جذبۂ دل جتنا صرفِ بے محل ہوتا گیا | اس قدر ذوقِ نظر بھی مبتذل ہوتا گیا

گئے جو دل سے تو دل کو خزاں بنا کے گئے
جو آئے دل میں تو آئے بہار کی صورت

آنسوؤں کی کمی نہیں لیکن
کچھ سبب تھا جو آنکھ تر نہ ہوئی

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

باہمہ ذوق آگہی، ہائے رے پستیِ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں، وہ اب آ رہے ہیں

حضورِ دوست یہی جرم زندگی نکلا
جناب شیخ کو تھا زعمِ پاکیِ دامن

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں
علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں

زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
زندگی کو داستاں در داستاں سمجھا تھا میں

سبھی اندازِ حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

لالہ و گل سے تجھ کو کیا نسبت
نامکمل سے استعارے ہیں

آتشِ عشق وہ جہنم ہے
جس میں فردوس کے نظارے ہیں

وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

حسن کی بے نیازیوں پہ نہ جا
بے اشارے بھی کچھ اشارے ہیں

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں

بے فائدہ الم نہیں بے کار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

ہم نے دنیا ہی میں دنیائے حقیقت دیکھی
یہیں دوزخ نظر آئی یہیں جنت دیکھی

واعظ نے اور نہ زاہد شب زندہ دار نے
مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے، تلوار بھی ہے
غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار
کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دل کی راحت
ذہن مفلس ہو تو ہر سود زیاں ہوتا ہے
حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

جان کر منجملہ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

زندگی آج بھی دلکش ہے انہیں کے دم سے
حسن اک خواب سہی عشق ایک افسانہ سہی
کون ایسا ہے یہاں عشق ہے جس کا بے لاگ
آپ کی جان سے دور آپ کا دیوانہ سہی

زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں یہی ہے یقینِ کامل
جہاں اٹھا کوئی تازہ فتنہ اٹھا تری رہگذر سے پہلے

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گذرے
خطا معاف زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گذرے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے
بھول جاتا ہوں سب ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے
آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

حسرت موہانی

حسنِ بے پروا کو خود بین وخود آراء کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کردیا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

ہے یہی رسمِ وفاداری کہ بے چون وچرا
وہ مجھے چاہیں نہ چاہیں میں انہیں چاہا کروں

اس درجہ غرور نا روا ہے
مانا کہ حضور خوب رو ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دوعالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

اس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت
تو نے ربط ان سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا
نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری

وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں
مجھے خود خواہشِ تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری

دیکھ اے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت ہیں
بنتے ہیں بدشواری، مٹتے ہیں بآسانی

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم کو پھر بھی ترا گلہ نہ ہوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

روبرو ان کے کچھ نہیں معلوم
کیا ہوا بے خودی میں کیا نہ ہوا

کون لاتا ترے عتاب کی تاب
خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا

عشق حسرت کے سب ہوئے قائل
ایک وہ دشمنِ وفا نہ ہوا

جب سے وہ مدعائے شوق رہا
پھر کوئی اور مدعا نہ رہا

حسن خود ہو گیا غریب نواز
عشق محتاجِ التجا نہ رہا

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ
تیر جس کا کبھی خطا نہ ہوا

حسن یا عشق کون ہے غالب
آج تک اس کا فیصلہ نہ ہوا

چھڑ گئی جب جمالِ یار کی بات
دیر تک ختم سلسلہ نہ ہوا

آپ کے ہاتھ سے کرم کہ ستم
جو ہوا مجھ پہ بے حساب ہوا

اب نہ وہ تم رہے نہ ہم افسوس
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

وہ بار بار سزا جرمِ عشق پر دیتے
مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں بودے دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

بزمِ ساقی کا یہ کیا حال ہوا میرے بعد
خم کہیں ہے تو صراحی ہے کہیں جام کہیں

سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ ایسے دلربا تم ہو
قیامت ہو، غضب ہو، قہر ہو، آفت ہو کیا تم ہو

اس نے کہیں حرفِ تسلی بھی ہو لکھا
پڑھتے ہیں اس امید پہ ہم بار بار خط

سبھی کچھ ہو چکا ان کا ہمارا کیا رہا حسرت
نہ دیں اپنا، نہ دل اپنا، نہ جاں اپنی، نہ تن اپنا

حال ابتر ہو عاشقوں کا تو ہو
زلفِ جاناں کو برہمی سے غرض

مانوس ہو چکے تھے ازل میں فنا سے ہم
اس انتہا کو جانتے تھے ابتدا سے ہم

کبھی اقرار ہے کبھی انکار
کچھ تری بات کا قیام نہیں

حسرت ہی پہ موقوف نہیں کوئے بتاں سے
لے جانہ سکا کوئی بھی ایمان سلامت

کہیں وہ آکے مٹادے نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

سر بسر ہے مری کتابِ سیاہ
کوئی گوشہ کہیں سفید نہیں

یہ بھی ہے ماننے کی بات کوئی
مرمٹیں ہم تمہیں خبر نہ لگے

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

بنے ہیں رونقِ محفل جس انجمن میں رہے
رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں رہے

ہم نے ہر ہر بات اپنے حق میں جانی آپ کی
مہربانی ہو کہ ہو نامہربانی آپ کی

سمجھتے ہیں کہ دھوکا کھا رہے ہیں
مگر پھر بھی وہیں ہم جا رہے ہیں

تلوک چند محروم

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب
اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

درخورِ تمنائے اقامت ہے تو گھر ہے
اس دارِ فنا میں کوئی جنت ہے تو گھر ہے

ہو قصرِ شہنشاہ کہ درویش کا چھپر
دونوں ہیں بحیثیت کاشانہ برابر

ایک حالت پہ رہ نہیں سکتی
پیکرِ انقلاب ہے دنیا

چند روزہ ہے اور فانی ہے
پھر بھی کیا لاجواب ہے دنیا

عالم جو اپنے علم پہ پھولا ہوا نہیں
ہم کو تو اس جہاں میں ابھی تک ملا نہیں

ہر شمع اپنے زعم میں یاں برقِ طور ہے — ہر کنکری کو ہمسریٔ کوہ نور ہے

ہر چند یہ رسائیِ دانش سے دور ہے — ہے یہ بھی جاننا کہ نہیں جانتا ہوں میں

ابھی مقاصدِ تعلیم سے ہیں دور بہت — اگرچہ پاس کراتے ہیں امتحاں استاد

نسرین وگل کے حسن کا گہنا ہے سادگی — سوزیوروں کا زیورِ زیبا ہے سادگی

محتاج زیوروں کا اگر ہے تو حسن کیا — لعل و گہر کا دست نگر ہے تو حسن کیا

تیرے عمل حسیں ہیں تو بے شک حسیں ہے تو — گو رشکِ ماہ تاب بظاہر نہیں ہے تو

زندگی راحتِ دوام نہیں — زندگی رنج وغم کا نام نہیں

تو ہے حکمت سے اس لئے خالی — کہ ہے کھانے سے ناک تک معمور

چپ ہے جب تک آدمی پردے میں ہے — گفتگو سے کھلتے ہیں عیب وہنر

جو بزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو بار مرتے ہیں — دلاور ایک بار اس دہرِ فانی سے گزرتے ہیں

غم سے اکثر ٹوٹتا ہے وقت وموسم کا نظام — شام ہو جاتی ہے صبح اور صبح ہو جاتی ہے شام

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن — رشتے یہ جتنے الفت ومہر ووفا کے ہیں

کیوں دیکھتے نہیں کہ کہاں ہیں گرے ہوئے — کیوں سوچتے نہیں کہ گرے ہیں کہاں سے ہم

بیکار زورِ نالہ وفریاد ہے اگر — چونکا سکیں نہ قوم کو خوابِ گراں سے ہم

بعد ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن — ہو گئی آساں ہر اک مشکل بآسانی مری

لختِ دل کھانے کو ہے، خونِ جگر پینے کو ہے — میزبانِ دہر نے کی خوب مہمانی مری

پھر میں خدا کو بھول کے یادِ صنم میں ہوں — محروم کیا کروں یہی مرضی خدا کی ہے

ملنے کا جب مزہ ہے کہ دل آپ کا ملے — ظاہر میں آپ مجھ سے ملے بھی تو کیا ملے

یہ آرزو ہے اب نہ رہے کوئی آرزو — یہ مدعا ہے اب دلِ بے مدعا ملے

نہ کی قدر افسوس اہلِ وطن نے — گئے نامراد اہلِ فن کیسے کیسے

ہوا راہِ فنا میں جب نہ کوئی ہم سفر اپنا	اکیلے کوچ کا ساماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

آنند نرائن ملا

دل میں کوئی غنچہ کبھی کھلتے نہیں دیکھا	اس باغ میں کیا آ کے بنالے گی خزاں اور
عشق کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر	یا تو بے ہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ
وہی حرص و ہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں	وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں
کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے	ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں
کسی قیمت پہ بھی انسانیت ڈھونڈے نہیں ملتی	مگر جنسِ خدائی اب بھی ارزاں ہے جہاں میں ہوں
ہوائے علم شمعیں روح کی گل کرتی جاتی ہیں	خرد کے ہاتھ میں دل کا گریباں ہے جہاں میں ہوں
ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں	ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں
نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے	ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے بھی شوق آزادی ہے لیکن کیا کروں اسکو	مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں
وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں	تا بہ کے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں
خونِ انساں سے لبالب آج ہے جامِ حیات	کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں
زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ	شاہد و شمع و شراب و جام کی باتیں کریں
توانا کو بہانا چاہیے شاید تشدد کا	پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام ہے
نہ جانے کتنی شمعیں گل ہوئیں کتنے بجھے تارے	تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

مرزا یاس یگانہ چنگیزی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا	خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے	میں کہاں ہار ماننے والا
سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا	سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا
مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں	پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا
بدگمانوں کی مہربانی سے کون ٹھہرے سمے کے دھارے پر	پاک دامن بچے نہ دامن چاک کوہ کیا اور کیا خس و خاشاک

اصغرؔ گونڈوی

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا	جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے	اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے	جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود
کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا	ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود
ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری	تمام شورش و تمکیں نثارِ بے خبری
داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن	ان میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی	کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے
یہ بھی فریب سے ہیں کچھ درد عاشقی کے شرح و بیانِ غم ہے اک مطلبِ مقید بارِ الم اٹھایا رنگِ نشاط دیکھا	ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے خاموش ہوں کہ معنی صد ہا ہیں خامشی کے آئے نہیں ہیں یونہی اندازِ بے حسی کے
ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی	زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں	ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی
الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے	غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھدی
رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے	جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے
گو نہیں رہتا کبھی پردے میں رازِ عاشقی	تم نے چھپ کر اور بھی اس کو نمایاں کردیا
اس طرح چھیڑ دے افسانۂ ہجراں کوئی	آج ثابت نظر آئے نہ گریباں کوئی
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں آ گئی	یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

شکیل بدایونی

رنج و مصیبت، جور و ستم	آپ کی خاطر سب منظور
یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک	مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے
اُس کثرتِ غم میں بھی مجھے حسرتِ غم ہے	جو بھر کے چھلک جائے وہ پیمانہ نہیں ہے
مختصر ایک تو ویسے ہی نہ تھی قیدِ حیات	اور معیاد بڑھادی شبِ تنہائی نے
اے سایۂ دامانِ کرم ڈھونڈنے والو	انجام بھی سوچا کبھی تقصیر سے پہلے
دل پہ بیتے لب پہ نہ آئے	ہائے محبت کا دستور
وہ اگر برا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بو میں	میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا
ان کی یاد، ان کی تمنا، ان کا غم	کٹ رہی ہے زندگی آرام سے
خزاں کے دم سے ہے قائم چمن کی رعنائی	اجڑ ہی جائے اگر مستقل بہار رہے
دور ہوں لیکن بتا سکتا ہوں ان کی بزم میں	کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے کو ہے
حقیقت میں وجود اسکا نہ ہونے کے برابر ہے	جو ذرہ خود چمک کر ماہِ تاباں ہو نہیں سکتا
دل اسکا بھی دل میرا بھی ہے فرق شکیل اتنا لیکن	وہ پتھر ہے جو ثابت ہے یہ شیشہ تھا جو ٹوٹ گیا

سکندر علی وجدؔ

عمر جینے میں جو گنوائی ہے
بس وہی اپنے کام آئی ہے
قیدِ الفت سے بھاگنے والو
یہ اسیری نہیں رہائی ہے

آگہی اپنی خطا ہو جیسے
بے بسی اس کی سزا ہو جیسے
کارواں لوٹ سے کوئی نہ بچا
راہ زن، راہ نما ہو جیسے
ظلم پر ظلم سہو کچھ نہ کہو
یہی آئینِ وفا ہو جیسے

ایسے روٹھے روٹھنے والے
روٹھ گیا سمجھانے والا
سب ساتھی ساتھی ہیں خوشی کے
کوئی نہیں غم کھانے والا

کچھ عجب حال دل پہ طاری ہے
بے خودی ہے نہ ہوشیاری ہے
وجدؔ ہر شعر حسن کا پیکر
شاعری ہے کہ حسن کاری ہے

کوئی آزاد نہیں شاد نہیں
سب مصیبت میں گرفتار ملے
علم و دانش کی گذرگاہوں میں
ہر قدم عقل کے بیمار ملے

ترے جلوؤں میں جو گم ہو گیا ہے
خبر ہے کچھ تجھے اس بے خبر کی
عبادت گر محبت ہے تو زاہد
عبادت ہم نے کی اور عمر بھر کی

یہ رہِ شوق ہے آزار یہاں اور بھی ہیں
یاس و ہجراں کے سوا سنگِ گراں اور بھی ہیں
علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز گنجینۂ فطرت میں یہاں اور بھی ہیں

یہ زمانہ عجب زمانہ ہے
کوہ کن کر رہا ہے شیشہ گری
باخبر بن کے کیا ہوا حاصل
کام آئی یہاں تو بے خبری
کوئی دشمن نہیں زمانے میں
کیا ہنر ہے کمال بے ہنری

بات کہتا ہے جو کھری اکثر
وہ بھی سنتا نہیں ہے بات کھری

اس نے جب مسکرا کے دیکھ لیا
تمکنت رہ گئی دھری کی دھری

...نے والے ہیں مرے پاس وہ اغیار کے ساتھ
اس خوشی سے تو جدائی کا ملال اچھا ہے

مل گیا شوخ دعاؤں کو اثر آج کی رات
پیکرِ مہر ہے وہ رشکِ قمر آج کی رات

دولت ہوش سرِ راہ لٹا بیٹھے ہیں
ہم کو درکار نہیں اپنی خبر آج کی رات

حسن والفت کے گلستاں میں بہار آئی ہے
مائل لطف ہے ہر شاخ وثمر آج کی رات

اے جنوں کوشش ناکام کے دن بیت گئے
اوج پر ہے علمِ فتح وظفر آج کی رات

کل پریشانی وحسرت کی فراوانی تھی
دل میں آباد ہے خوشیوں کا نگر آج کی رات

گرم سانسوں کی مہک، نرم نگاہوں کی کسک
شرکتِ صبر ہوئی زیروزبر آج کی رات

بارِ ہستی کا ذرا روح کو احساس نہیں
ڈھل گئے نور کے سانچے میں بشر آج کی رات

آرزوؤں کا تقاضہ ہے کہ ہوجائے یونہی
زندگی کی شبِ تاریک بسر آج کی رات

نوجواں جسم، لپکتے ہوئے عریاں شعلے
ضبط کی تاب ادھر ہے نہ ادھر آج کی رات

درد کا، لفظ کا، آواز کا آہنگ نیا
دل دھڑکتے ہیں باندازِ دگر آج کی رات

جرأت انگیز ہیں سرشار بدن کے خط وخم
مست ومغرور ہے شہبازِ نظر آج کی رات

نہ تردد، نہ تکلف، نہ تامل، نہ حیا
جذبۂ شوق ہے بے خوف وخطر آج کی رات

کیا ٹھہرنا ترا ممکن نہیں اے عمرِ رواں
نہیں ممکن تو پھر آہستہ گزر آج کی رات

محفل میں ترے ذکر پہ آنسو نکل آئے
نادم ہوں چھپایا نہ گیا رازِ محبت

...ب ہجر میں آنسو ہیں، نہ آہیں ہیں نہ نالے
کوئی نہ رہا مونس ودم سازِ محبت

نگاہیں پریشاں تھیں جس کے لئے
وہی حاصلِ انتظار آگیا

ہوئے ختم دم بھر میں شکوے گلے
ذرا مسکرایا تو پیار آگیا

تسلی ہوئی طرزِ گفتار سے
ہر اک عذر کا اعتبار آ گیا

بے ہوشی ہے شرطِ مسرت
اب کیوں ہوش میں آئیں گے ہم
اہلِ جنوں فردوس بداماں
اہلِ خرد فی نارِ جہنم

موت رونے سے ٹل نہیں سکتی
یہ تمنا نکل نہیں سکتی
نوجوانی کے تیز دھارے پر
عقل کی ناؤ چل نہیں سکتی
اس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا
اب طبیعت سنبھل نہیں سکتی
وجدؔ تم ہی ذرا بدل جاؤ
ساری دنیا بدل نہیں سکتی

مائلِ لطف و کرم ساقیِ گلفام ہے آج
ہر نظر گل کدہ بخشش و انعام ہے آج
اک نئے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
دلِ بے تاب کو آرام ہی آرام ہے آج
یہ مضامین، یہ الفاظ، یہ آہنگ، یہ رنگ
باغِ افکار پہ کیا بارشِ الہام ہے آج

اک نئے گل سے محبت ہو گئی
سیرِ گلشن اب عبادت ہو گئی
اے جنوں یہ شہرِ دل تاریک تھا
روشنی تیری بدولت ہو گئی
عشق کے رنگین افسانے کے بعد
ہر کہانی بے حقیقت ہو گئی

حالِ دل ہم نے اپنا چھپایا بہت
ساری دنیا کو لیکن خبر ہو گئی

مخدوم محی الدین

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں

میرے سجدوں کیلئے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیمِ انا میں دوسرا کوئی نہیں

میری آنکھوں کی زباں اور مرے دل کی آواز
نہ سمجھنے کے لئے ہے نہ سنانے کے لئے

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

ہم کو بے مائیگیِ ضبط دکھانا ہی پڑا
دل کی باتوں کو ترے سامنے لانا ہی پڑا

اور کیا ہوگی کسی کی کائناتِ سال و سن
عشق کی دو چار راتیں، حسن کے دو چار دن

آہ پہلے نارسا تھی اب کہیں رکتی نہیں
اب کسی کے آستانے پر جبیں جھکتی نہیں

گھر کے ہر ذرے سے ناسور کی بو آتی ہے
قبر کی، عود کی، کافور کی بو آتی ہے

ہم اسیروں کی بھی اک عمر بسر ہوتی ہے
نہ تو موت آتی ہے ہمدم نہ سحر ہوتی ہے

شعریؔ بھوپالی

ہم جدھر تھے ادھر نہ تھا کوئی
وہ جدھر تھا ادھر زمانہ تھا

تیرا دریا، تیرا طوفاں، تیری موج
تو جہاں چاہے وہاں ساحل بنا

ان کو رخصت تو کر دیا لیکن
کچھ نہ پوچھو جو دل کا حال ہوا

چھپ کے پینا نہیں شعار مرا
آشکارا شکار پیتا ہوں

محبت میں جو ناممکن ہے ممکن ہو ہی جاتا ہے
وہ حالت ہو کے رہتی ہے جو حالت ہو نہیں سکتی

نگاہِ مست کے ساغر وہ یوں تقسیم کرتے ہیں
کہ محفل میں کسی کو بھی شکایت ہو نہیں سکتی

ہمیں تم نے ستایا ہے، رلایا ہے، مٹایا ہے
یہ باتیں ان سے کہہ دیں اتنی جرأت ہو نہیں سکتی

زمانہ کسطرح واقف ہو برقِ عشق سے شعریؔ
جو بجلی دل پہ گرتی ہے نظر آیا نہیں کرتی

کبھی ملے تمہیں فرصت تو سوچنا تم بھی
کہ کیوں شکست کیا ربطِ باہمی میں نے

نفس نفس ہے پریشاں، نظر نظر ہے اداس
کہیں سے آئے ہیں شعریؔ لٹے لٹائے ہوئے

جا رہا ہوں لیکے عرضِ شوقِ دید
کاش وہ کہہ دیں ہمیں منظور ہے

دیکھنے سے نظر نہیں بھرتی
ان کی صورت بھی کتنی پیاری ہے

وہ اگر مل جائیں تو کیا حشر ہو
دل لرز جاتا ہے جن کے نام سے

میری بربادی پہ کیوں ہے اضطراب
آپ مستثنیٰ ہیں اس الزام سے

اب نہ آنا کہیں نہ جانا ہے
فرصتِ شوق کا زمانہ ہے

ہائے مجبوریاں مروت کی
پھر اسی انجمن میں جانا ہے

انجم فوقی بدایونی

اس نے مجبورِ وفا جان کے منہ پھیر لیا
مجھ سے یہ بھول ہوئی پوچھ لیا کیسے ہو

تم کوئی بات سمجھتے ہی نہیں
بس اسی بات سے ڈر لگتا ہے

رشتوں میں خلوص ہی کہاں تھا
پہلے ہی یہ دودھ پھٹ چکا ہے

ہر شخص وفا سے ہٹ چکا ہے
شیشوں پہ غبار اٹ چکا ہے

اظہارِ خلوص کرنے والا
اندر سے بہت پلٹ چکا ہے

کس سے ہم بے لوث ملے تھے
اپنے ہی کچھ کام رکے تھے

نیت اچھی کام برے تھے
اس حد تک بھی لوگ بھلے تھے

ہوتے ہوتے ہی غمِ دل کا مداوا ہوگا
ایک دن کا تو یہ آزار نہیں ہے اے دوست

جوانی جتنے منہ اتنی ہی باتیں
محبت آج بھی رسوا نہیں ہے

وفا میں راحتیں کیا ڈھونڈتے ہیں
وفا دیوار ہے سایہ نہیں ہے

تم کبھی پرسشِ حالات کی زحمت تو کرو
کون سی بات ہے ایسی جو مجھے یاد نہیں

کس قدر طول تھی معیادِ اسیری توبہ
اب بھی یہ وہم سا ہوتا ہے کہ آزاد نہیں

بندگی کرتے کرتے خدا ہوگیا
آدمی کو خدا جانے کیا ہوگیا ہے

پھونک دو میرے آشیانے کو
روشنی تو ملے زمانے کو

میں جیسے اجنبی کوئی اپنے دیار میں	تم جیسے میرے ذہن میں کوئی سوال ہو
آؤ ماحول کے اس رخ پہ بھی کچھ بات کریں	پھول بے کیف ہیں کانٹوں پہ بہار آئی ہے
صدیوں سے انسان ہے دکھ میں	دو دن کا یہ درد نہیں ہے
آئے ہو تو بات کرو آپ کی عظمت محفل سے آپ لبوں کو سی دیکھیں ذہن اگر سنجیدہ ہوں	کیسی شرم کہاں کا راز تنہائی کو مجھ پر ناز اور بھی پھیلے گی آواز خاموشی بھی ہے آواز
یہ کس ماحول میں ہم آ گئے ہیں	کوئی اپنا یہاں اپنا نہیں ہے
صبر میں ہر دکھ اپنا دکھ ہے	رونے میں ہر چوٹ پرائی
بجھتے جاتے ہیں قلب و نظر کے دیے	صبح آئی تو لیکن اندھیرے لئے
حادثوں سے فرار کیا معنی	حادثے زندگی بناتے ہیں
ہم جو چاہیں خود ہی لکھ دیں	سادہ کاغذ ہیں تقدیریں
اتنی آسودگی بھی کیا انجم	دل غمِ روزگار کو ترسے
بھلا ایسی بھی کوئی چیز تھے انجم یہ دو تنکے	مجھے اکثر ہنسی آئی ہجومِ برق و باراں پر
شکستِ الم غیر ممکن نہیں ہے	مگر حوصلہ چاہیے آدمی میں

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

شکل انسان کی ہو چال بھی انسان کی ہو	یوں بھی آتی ہے قیامت مجھے معلوم نہ تھا
میں سرِ عرشِ بریں ڈھونڈ رہا تھا اس کو	ماں کے قدموں میں تھی جنت مجھے معلوم نہ تھا
ثوابِ خلدِ بریں کیا، عتابِ دوزخ کیا	تیرے خطاب کی ٹھنڈک، ترے عتاب کی آنچ

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

نگاہِ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جسطرح معنی جان لیتے ہیں

رفیقِ زندگی تھی اب انیسِ وقتِ آخر ہے
ترا، اے موت، ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

شام بھی تھی دھواں دھواں عشق بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

رنج و راحت، وصل و فرقت، ہوش و وحشت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

عشق نے اپنی جان کو روگ کئی لگا لئے
ہجر و وصال، امید و بیم، کون وبالِ جاں نہ تھا

اب نہ وہ پرسشِ کرم، اب نہ وہ چشمِ آشنا
شکوۂ عشق بر طرف تجھ سے تو یہ گماں نہ تھا

مٹا مٹا کے محبت سنوار دیتی ہے
بگڑ بگڑ کے یونہی زندگی بنائے جا

فراق چھیڑ دیا تو نے کیا فسانہ درد
سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر سنائے جا

گلوں کی جلوہ گاہِ ناز میں نہ ڈھونڈ اب مجھے
میں نقش تھا مٹا دیا، چراغ تھا بجھا دیا

آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہیکہ جو تھا

منازلِ ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے
کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا

خیال کو بے اثر نہ سمجھو، عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

کوئی کہاں تک اب اپنی ہی جان کو روئے
یہ سانحہ تو محبت میں ہو چکا کب کا

جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلوؤں کی
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
درو دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا
فراقؔ ایک اک سے بڑھکر چارہ سازِ درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی امید
خبر نہیں مجھے کیوں تیرا انتظار ہے آج

ثوابِ خلدِ بریں کیا، عذابِ دوزخ کیا
ترے خطاب کی ٹھنڈک ترے عتاب کی آنچ

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

عنایت کی، کرم کی، لطف کی آخر کوئی حد ہے
کوئی کرتا رہے گا چارۂ زخمِ جگر کب تک
فراقؔ ایامِ فرقت کی درازی بھی تو دھوکا ہے
سحر بے شام کی کبتک یہ شامِ بے سحر کب تک
نظامِ دہر بدلے، آسماں بدلے زمیں بدلے
لئے بیٹھا رہے کوئی حیاتِ بے اثر کب تک

حسن ہے دریا عشق ہے شعلہ
پانی میں لگ جائے آگ
آتے ہی جل اٹھے چراغ
روپ ہے تیرا دیپک راگ

سب کی حالت ایک ہے ناداں
کون ہے غمگیں، کون ہے شاداں
چڑھتی چلی ہے حسن کی قیمت
جنسِ حسیں ہے ارزاں ارزاں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی
کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
عمر فراقؔ نے یوں ہی بسر کی
کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

ہم غم زدوں کی گفتگوئے تلخ پر نہ جا
قسمت بری سہی یہ طبیعت میری نہیں

جو الجھی تھی کبھی آدم کے ہاتھوں
وہ گتھی آج تک سلجھا رہا ہوں

ہم تو کہتے ہیں وہ خوشی ہی نہیں
جس میں غم کا کچھ امتزاج نہیں
تجھ سے چھٹ کر بڑی فراغت ہے
اب مجھے کوئی کام کاج نہیں

اس رہ گزار پر ہے رواں کاروانِ عشق
کوسوں جہاں کسی کو خود اپنا پتہ نہیں
میں کامیابِ دید بھی ناکامِ دید بھی
ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں

ابھی کچھ اور ہو انسان کا لہو پانی
ابھی حیات کے چہرے پہ آب و تاب نہیں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

نثار پرسش غم کے میں کیا کہوں آخر
کہ اب وہ تجھ سے مری بدگمانیاں نہ رہیں

اف یہ فضا اداس اداس آہ یہ موج رودِ شام
یاد سی آ کے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

ہم آہنگی بھی تیری دوری کی قربت نما نکلی
کہ تجھ سے مل کے بھی تجھ سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں
وہ عالم اور ہی ہے جس میں میٹھی نیند آ جائے
غم و شادی میں سونے کیلئے راتیں نہیں ہوتیں

غم کشتگانِ عشق سے اتنا نہ کر گریز
کچھ کام آ رہی ہیں یہ بے کارہستیاں
دونوں سے بے نیاز ہوں کیا موت کیا حیات
ہیں رشکِ صد نشاط مری غم پرستیاں
اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یادوں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی ہے
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گذر پھر بھی
خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوت نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

تجھے پا کر نہ جانے کس لئے آنسو نکل آئے
محبت میں خوشی بھی کس قدر اندوہ گیں نکلی

تری معصومیاں اے عشق رسوا سب بجا لیکن
یہ دنیا ہے فرشتوں پر بھی تہمت آ ہی جاتی ہے

قوموں کو گمراہ کیا ہے
شاعر کی بے راہ روی نے

ہزار آنکھ چرا ؤ یہ کوئی طور نہیں
تمہارے سامنے یہ میں ہوں کوئی اور نہیں

کیوں داستانِ عمر گذشتہ نہ چھیڑیے
اے دوست زندگی تو مصیبت ہے ان دنوں

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے پیار کریں

قیامت ہے قیامت دیکھنا تجھ کو نظر بھر کر
مگر یہ کام اب ہم ہرچہ بادا باد کرتے ہیں

ناطق گلاؤٹھی

میں ہی تیرا ہوں تو پھر کیا کہوں میرا کیا ہے	تو ہی میرا ہے تو پھر کس لئے میرا تیرا
نہ ہو ملول برا وقت سب پہ آتا ہے	کسی کے ساتھ زمانہ وفا نہیں کرتا
اب کہاں گفتگو محبت کی	ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا
کوئی جاتا ہے تو جائے کس کو پروا ہے یہاں	بزمِ عالم یہ کہو سونی ہوئی ہے کس کے بعد
نظر آتی نہیں کچھ رشتۂ الفت کی خیر اب تو	ادھر ہم کھنچ کے بیٹھے ہیں ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
باقی نہیں جہاں میں کوئی مانگنے کی چیز	اب ہاتھ بھی اٹھاؤں تو میں کیا دعا کروں
کیوں نہیں پھرتے کبھی عاشق کے دن	کیا الگ ہیں گردشِ ایام سے
کیا کہیے کتنے زہر کے پینے پڑے ہیں گھونٹ	ہے تلخیٔ حیات جو میرے دہن میں ہے
چلتا ہے بس تو دیکھ رہے ہیں چلا کے زور	مجبور کر دیا ہے ہمیں اختیار نے
کس کس سے کیا بتایئے کھاتے رہے فریب	ناطق ہمیں تباہ کیا اعتبار نے
تھا تو اندھیر بھی ناطق مگر ایسا تو نہ تھا	تھی مگر گردشِ دوراں کبھی ایسی تو نہ تھی

چکبست

کچھ ایسا پاسِ غیرت اٹھ گیا اس عہدِ پرفن میں	کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں
شجر سکتے میں ہیں خاموش ہیں بلبل نشیمن میں	سدھارا قافلہ پھولوں کا سناٹا ہے گلشن میں
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب	موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا
جنونِ حبِ وطن کا مزہ شباب میں ہے	لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے	وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

اہلِ ہمت منزلِ مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت کا گلہ کرتے ہیں

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

دل ہی بجھا ہو تو لطفِ بہار کیا
ساقی ہے کیا، شراب ہے کیا، سبزہ زار کیا
یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا
جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

دل ہی کی بدولت رنج بھی ہے دل ہی کی بدولت راحت بھی
یہ دنیا جس کو کہتے ہیں ہے دوزخ بھی اور جنت بھی

حفیظ بنارسی

ساری فرعونیت حفیظ اک دن
غرقِ دریائے نیل ہوتی ہے

زندگی نامِ رنج و غم ہی سہی
مل گئی ہے تو اس سے پیار کرو

کبھی موسیٰ، کبھی فرہاد، کبھی قیس حزیں
عشق نے دہر میں کیا کیا نہ بنایا ہم کو

ادھر بھی تباہی، ادھر بھی تباہی
کہاں جائیں آخر محبت کے راہی

ہم پشیماں نہیں نازاں ہیں خطائے دل پر
جرم ہے عشق تو یہ جرم ہوا ہے ہم سے

حسن جس شکل میں جہاں بھی ہو
ایک سرچشمۂ مسرت ہے
صرف کی جے تو اور بڑھتی ہے
علم وہ لازوال دولت ہے
کون سلجھائے گیسوئے دوراں
اپنی الجھن سے کس کو فرصت ہے

بیمار جب نہ تھے تو ہزاروں تھے چارہ گر
بیمار جب ہوئے تو کوئی چارہ گر نہیں

آلامِ روزگار سے گھبرائیں کس لئے
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

تدبیر کے دستِ رنگیں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مدد فرماتی ہے جب کوششِ انساں ہوتی ہے

دورِ آساں ہے مشکلات کے بعد — صبح لازم سیاہ رات کے بعد

ایک لغزش میں سج گئی دنیا — کیا مقدس گناہِ آدم ہے

حضرت نوح ناروی

پیچھے پیچھے جا رہے ہیں اقربا روتے ہوئے — آگے آگے ہے جنازہ عاشقِ دلگیر کا
انکو حیرت مجھکو سکتہ وہ بھی چپ میں بھی خموش — ہو رہا ہے سامنا تصویر سے تصویر کا

کبھی دنیا کے جھگڑے ہیں کبھی عقبیٰ کے قصے ہیں — ہمارے دل کو اطمینان حاصل ہو نہیں سکتا

جانتا ہو جو محل ہر بات کا — کیا ٹھکانا اس کی معلومات کا
لوگ کر لیتے ہیں کیوں کر اعتبار — تیری میری، اس کی اس کی بات کا
چل دیئے اٹھ اٹھ کے میرے چارہ ساز — ہے بھروسہ اب خدا کی ذات کا

آہوں پہ جفا شکوؤں پہ ستم سو بار ہوئی سو بار ہوا — ہر بات مجھے ہر کام مجھے دشوار ہوئی دشوار ہوا
ساقی کی نشیلی آنکھوں سے ساری دنیا سارا عالم — بدمست ہوئی بدمست ہوا سرشار ہوئی سرشار ہوا
اے نوح یہ کیا سوجھی تمکو طوفان اٹھایا کیوں تم نے — ساری دنیا سارا عالم بیزار ہوئی بیزار ہوا

یہ حال ہے میرے مرقد کا عالم ہے یہ میرے مدفن کا
صرصر نے کسی دن جھاڑ و دی چھڑکاؤ کبھی شبنم نے کیا
یوں آپ بگڑنے کو بگڑیں لیکن یہ ذرا سوچیں سمجھیں
کیا صرف ہمیں نے عشق کیا دنیا نے کیا عالم نے کیا

سنئے سنئے ماجرائے شوق سنئے شوق سے — آپ نے چھیڑا تو مجبوراً مجھے کہنا پڑا

چار دن کی زندگی میں یہ نہ پوچھ اے ہم نشیں
کیا مجھے کرنا پڑا، سننا پڑا، کہنا پڑا

کہتے تھے رہیں گے ہم پہلو میں ترے آ کر
وہ آ گئے پہلو میں اب صرف رہا رہنا

عذر یہ چلتا ہوا ان کا دمِ الزام تھا
میں نے پوچھا کیوں نہ آئے کہہ دیا کچھ کام تھا

زندگی جب تک رہے گی روز آفت آئے گی
ختم ہی ہونگے تو ہوگا خاتمہ بے داد کا

مرض تھا کچھ مجھے، درماں ہوا کچھ
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا

اس سے امید بہت کچھ تھی مگر کیا کہیے
کام وہ بھی مری مشکل میں بمشکل آیا

وہ کہتے ہیں آ و مری انجمن میں مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا بلا کر بٹھایا بٹھا کر اٹھایا اٹھا کر نکالا
پڑی نیو آپس میں گو دوستی کی مگر دوستی کس طرح نبھ سکے گی
اسے ہے نزاکت مجھے ہے نقاہت نہ وہ آنے والا نہ میں جانے والا

پائی تھی ایک جان ترے جاں نثار نے
لیکن ہزار جان سے قربان ہو گیا

رہتا ہے کوئے یار میں حاضر تمام دن
کیوں عرش پر دماغ نہ ہو آفتاب کا

مشیت نے دنیا کی نظروں کے آگے ہمیشہ کیا پیش طرفہ نظارہ
کسی کو بنایا کسی کو بگاڑا کسی کو دبایا کسی کو ابھارا
کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے، محبت کبھی یہ تغیر دکھائے
بدل جائے دل اور دل ہو بدل کر، ہمارا تمہارا، تمہارا ہمارا

ہم یہ کہتے ہیں کہ ٹھہرو رات ابھی گذری نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ جانے دو سویرا ہو گیا

ہے بھی دریائے عشق میں کہ نہیں
نام ہی سن رہا ہوں ساحل کا

چار حرف آرزو پہ چار حکم اس نے دیے
دور ہو، گھر سے نکل، اب جلد اٹھ، بستر اٹھا

کیوں نہ ہوگا پار بیڑا دل میں ہمت چاہیے
ناخدا لیکر خدا کا نام تو لنگر اٹھا

سیکڑوں ظالم ومظلوم نظر آئیں گے
حشر کا حشر تماشا کا تماشا ہوگا

چار دن کی زندگی میں مختصر سی عمر میں
کیا بتاؤں، کیا کہوں، کیا کیا کیا، کیا کیا ہوا

میں ہوا بیمار تم نے جب کہا بیمار ہو
اور جب تم نے کہا اچھا ہو میں اچھا ہوا

اس طرح وہ پوچھتے ہیں مجھ سے میرا حال دل
پھر بتاؤ، پھر کہو، ہاں کیا کہا، ہاں کیا ہوا

کبھی چھپے، کبھی نظروں کے سامنے آئے
ابھی حجاب تھا ان کو ابھی حجاب نہ تھا

الگ آنا، الگ جانا، الگ رہنا، الگ پھرنا
رہِ الفت میں ہمکو سب سے سب کو ہمسے کیا مطلب

ہزار کوس رہی ہم سے منزل مقصود
اڑائی وادی غربت کی ہم نے دھول عبث

جو آتے آتے وہ آئے تو آئے وقت سحر
دعائے نیم شبی اب ہوئی قبول عبث

ریاضِ دہر کو دیکھیں نگاہ غور سے ہم
نہ ایک خار عبث ہے نہ ایک پھول عبث

سیکڑوں قسم کے ستم سہئے کچھ نہ اپنی زبان سے کہئے

رات دن بیقرار ہی رہئے عشق کا ہے یہی قدیم علاج

درد الفت کبھی ہوا نہ خفیف، کیا کرے ضبط آہ ایک نحیف

کل تھی پرسوں سے پیشتر تکلیف، کل سے تکلیف ہے زیادہ آج

عشق میں کب ہوئی کسی کو شفا، چارہ سازی سے بڑھ گئی ایذا

کر رہا ہے جو درد دل کی دوا، عقل کا اپنی خود کرے وہ علاج

جان دے کر بھی بہت ہوں منفعل
حسن کے آگے ہے یہ نذرانہ ہیچ

وہ بلائیں مجھ کو یا تشریف لائیں میرے پاس
دو ہی شکلیں زیست کی ہیں اسطرح یا اسطرح

کیا ضرورت ظلم کی جب لطف سے چل جائے کام
اس طرح دل کو نہ لوٹو بلکہ لوٹو اس طرح

التجاؤں سے خوشامد سے بیان حال سے
میں انہیں راضی کروں گا ہونگے راضی جسطرح

چار کو خوش ہم نے رکھا چار سے خوش ہم ہوئے
چار دن کی زندگی اپنی گذاری اس طرح

ہمیں ملا بھی تو معشوق کس طرح کا ملا — جفا پسند، بد اخلاق، فتنہ گر، گستاخ
یہ تجربے نے بتایا یہ عادتوں سے کھلا — وہ جس قدر ہے مہذب اسی قدر گستاخ

ادا نے دل بھی لیا ناز نے جگر بھی لیا — بچا ہی کیا مرے پہلو میں لوٹ مار کے بعد
فقط بہار میں پیتے ہیں ہم نہیں پیتے — کبھی بہار سے پہلے کبھی بہار کے بعد
ہزار تک وہ مجھے بددعائیں دیتے ہیں — شروع ایک سے کرتے ہیں پھر ہزار بعد

نگاہِ ناز میں دل کا کچھ اقتدار نہیں — اگر ابھی ہے وہ مقبول تو ابھی مردود
یہاں ادائے فرائض کی صورتیں ہیں جدا — نمازِ عشق میں واجب نہیں رکوع و سجود

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد — ملی زندگی مجھ کو مرنے کو بعد

کسقدر ہوتے ہیں ناخوش کسقدر ہوتے ہیں خوش — آپ ہم کو دیکھ کر اور آپ کو ہم دیکھ کر
رہے گا تذکرہ اہلِ وفا میں رہتی دنیا تک — بقا کا مرتبہ حاصل کیا ہم نے فنا ہو کر
ترے بیمارِ غم کا حالِ غم دیکھا نہیں جاتا — اب ایسے میں مناسب جو دعا ہو یا دوا ہو کر

وہ عرضِ تمنا کو فریاد سمجھے وہ فریاد کو غم کی روداد سمجھے
ذرا سی مری بات تھی لیکن اسکا ہوا رفتہ رفتہ کہاں تک بتنگڑ

مزہ جب ہے آپس میں کچھ جنگ بھی ہو، مزہ جنگ میں جب ہے کچھ صلح بھی ہو
دکھا دے تلون کا اپنے تماشا ادھر لڑ، ادھر مل، ادھر مل، ادھر لڑ

کہنے کو ہے سارا جہاں سچے فدائی ہیں کہاں — دس میں نہ نکلے گا کوئی دس لاکھ میں نکلیں گے دس
طولِ غم و آزار نے ناشاد مجھ کو کر دیا — ہے ایک گھنٹہ ایک دن ہے اک مہینہ اک برس

چھوڑ کر دل کو درد جائے کہاں — یہ مکیں ہے اسی مکان سے خوش

جہاں میں ہر شئے ہے آنی جانی، نشاط و غم اضطراب کب تک
یہ جوش کب تک، امنگ کب تک، ترنگ کب تک، شباب کب تک

اگر ہو ملنا تو ہم سے ملئے نہ ہو جو ملنا تو صاف کہیے
سلام کب تک، پیام کب تک، سوال کبتک، جواب کب تک

پھر کبھی مے سے توبہ کرلوں گا — اب تو بوتل کا کھل گیا ہے کاگ
چور سے کہہ رہے ہیں چوری کر — اور وہ کہہ رہے ہیں شاہ سے جاگ

حال ان کا پوچھتا پھرتا تھا دیوانہ کبھی — لیکن اب وہ پوچھتے پھرتے ہیں دیوانے کا حال
بات گھر کی خاص گھر والوں سے چھپ سکتی نہیں — ہر برہمن جانتا ہے اپنے بت خانے کا حال

آج آئیں گے کل آئیں گے کل آئیں گے آج آئیں گے
مدت سے یہی وہ کہتے ہیں مدت سے یہی ہم سنتے ہیں

قدرت جو خدا کی ہے وہ آ ہی نہیں سکتی — ادراکِ بشر، فہمِ بشر، عقلِ بشر میں

خاک سے پیدا ہوا یہ خاک میں مل جائے گا — خاک دانِ دہر میں انسان کیا ہے کچھ نہیں
میں فقیرِ بے غرض ہوں بے غرض کے واسطے — نفع کیا ہے کچھ نہیں، نقصان کیا ہے کچھ نہیں
مرنے والے، لٹنے والے، مٹنے والے کیلئے — جان کیا ہے، آن کیا ہے، شان کیا ہے کچھ نہیں

پھر بھی نہ ہوا ختم محبت کا فسانہ — سنتے ہی رہے لوگ سناتا ہی رہا میں
مقدار تو معلوم ہو تعداد تو کھل جائے — ایک ایک جفا تم گنو ایک ایک وفا میں
تھا بھی تو کسی آنکھ کا ٹوٹا ہوا آنسو — ہوں بھی تو کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا میں

وہ کہہ گئے ہیں رہیں گے ترے گھر آئیں گے — اب آئیں آئیں نہ آئیں رہیں رہیں نہ رہیں

جو پوچھتا ہوں تو اختر شناس کہتے ہیں — کہ شامِ غم کی سحر ہے بھی اور ہے بھی نہیں
میں برا تم کو کہوں تم مجھ کو، اس سے فائدہ — آؤ مل جائیں لڑائی کا خیال اچھا نہیں

پھر گذارش کا مجھے وقت ملے یا نہ ملے — جو مرے دل میں ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں

پامالِ ستم کچھ لوگ رہے محصورِ الم کچھ لوگ رہے — ان سب کا خلاصہ اتنا ہے دنیا میں کوئی دل شاد نہیں

جہاں میں آیا، جہاں میں رہا، جہاں سے گیا
علاوہ اس کے مری داستان کچھ بھی نہیں
جو نالہ ہم نے کیا اس کا ذکرِ پیہم ہے
جو تم نے غم دیے ان کا بیان کچھ بھی نہیں

میں نے کہا کب آؤ گے اس نے کہا محال ہے
میں نے کہا کہاں ملوں اس نے کہا کہیں نہیں

مرے، مر کر جیے، پھر مر گئے وہ بھی جوانی میں
یہی ہیں چند باتیں اہلِ الفت کی کہانی میں
جو میں روتا ہوں تو آنکھوں سے گرم آنسو نکلتے ہیں
خدا جانے لگا دی آگ کیونکر تم نے پانی میں
خیالِ زہد و تقویٰ ہر کسی کو چاہیے لیکن
نہیں آتا، نہیں ہوتا، نہیں رہتا جوانی میں

پوچھتا ہے جو کوئی میرا حال
سب سے پہلے کراہتا ہوں میں

ہم جو کہتے ہیں وہ تم کرتے نہیں
تم جو کہتے ہو وہ ہم کرتے نہیں

کبھی تو ہم یہاں وہاں کا کبھی تصور ادھر ادھر کا
سکون و راحت سے کیا تعلق کہ بدگمانی ہے اور ہم ہیں

پایا نہ فرق کچھ بھی سوچا جو ہم نے جی میں
دانا کی دشمنی میں ناداں کی دوستی میں
موسیٰ سے اور مجھ میں جلوؤں کی بحث کیسی
وہ کوہ طور پر ہیں میں ہوں تری گلی میں
عمرِ ابد کی خواہش اے خضر کیا کریں ہم
لاکھوں الم اٹھائے دو دن کی زندگی میں
غنچہ تو گل بنے گا گل کچھ نہ بن سکے گا
وہ پھول میں کہاں ہے جو بات ہے کلی میں
اچھی کہی بھلا دو کیونکر کوئی بھلا دے
سو دن کی دوستی کو دو دن کی دشمنی میں

مشغولِ ستم کون ہے مشغولِ ستم آپ
مصروفِ فغاں کون ہے مصروفِ فغاں میں

یہیں رہنا بھی مر کر دفن ہونا بھی یہیں ہم کو
نہ چھوڑیں گے زمیں کو ہم نہ چھوڑے گی زمیں ہمکو

ترا کوچہ ہے، تیری انجمن ہے، تیری چوکھٹ ہے
ٹھہرنے کا ٹھکانا مل ہی جائے گا کہیں ہم کو
یہاں آنے نہیں دیتے وہاں جانے نہیں دیتے
تمہارے ہم نشیں تم کو ہمارے ہم نشیں ہم کو
زمانے میں ہزاروں عاشق و معشوق تھے لیکن
ملے قسمت کی خوبی سے ہمیں تم کو تمہیں ہم کو

رات کچھ، دن کچھ، سحر کچھ، دوپہر کچھ، شام کچھ
حضرتِ دل ہو نہ ہو تم بھی مزاجِ یار ہو

اے نگاہِ شرمگیں اٹھ اور اپنا کام کر
اسکے اسکے انکے انکے سب کے دل کے پار ہو

چارۂ آزارِ الفت ننگ ہے میرے لئے
دردِ دل اک بار ہو، دس بار ہو، سو بار ہو

بہت اچھی یہی تدبیر ہے رفعِ کدورت کی
نہ اپنے دل میں ہم رکھیں نہ اپنے دل میں تم رکھو

پہنچے تو یا خدا کبھی بابِ قبول تک
مانا وہ اور کی ہو ہماری دعا نہ ہو

دل ہماری طرف سے صاف کرو
جو ہوا سو ہوا معاف کرو

کیوں بجھاؤ پہلیاں بے کار
گفتگو مجھ سے صاف صاف کرو

ایک دو تین چار پانچ نہیں
سب خطائیں مری معاف کرو

ہر روز نیا روز نئی صبح نئی شام
آرام سفر میں ہے مجھے گھر سے زیادہ

بے عزتی سے عمر جو گذری تو لطف کیا
دنیا میں کچھ رہے نہ رہے آبرو رہے

باغِ ہستی میں نہیں کچھ فصلِ گل کا اعتبار
قاعدہ ہے جو کھلیں گے پھول وہ مرجھائیں گے

کہہ گئے ملنے کو لیکن رہ گئی مبہم یہ بات
وہ یہاں آئیں گے یا مجھکو وہاں بلوائیں گے

میں یہ سنتا ہوں بڑے صاحبِ تدبیر ہیں آپ
اپنے ملنے کی بتا دیجئے تدبیر مجھے

جوانی میں نرالا ڈھنگ انوکھا طور ہوتا ہے
یہ دن، یہ سن، یہ عالم، یہ زمانہ اور ہوتا ہے

نریش کمار شاد

عداوت ہی جب حاصلِ دوستی ہے
محبت کی پھر آرزو کیوں کریں ہم

طوفانِ غم کی تند ہواؤں کے باوجود
اک شمعِ آرزو ہے جواب تک بجھی نہیں

رنج و الم کی، ہوش و خرد کی، جذب و اثر کی باتیں ہیں
ایک ذرا سا دل ہے جسمیں دنیا بھر کی باتیں ہیں

آنکھ جنہیں ٹپکا نہ سکی
شعروں میں وہ اشک ڈھلے

اتنا بھی ناامید دلِ کم نظر نہ ہو
ممکن نہیں کہ شامِ الم کی سحر نہ ہو
یہ پیچ و خم تو خیر سفر کے رفیق ہیں
ڈرتا ہوں راستے میں کوئی راہ بر نہ ہو
دنیا کی ہر خوشی ہو یقیناً وبالِ جان
اے شادؔ زندگی میں کوئی غم اگر نہ ہو

نگہ ناز ہے خاموش مگر کیا کہنا
اس خموشی میں بھی لرزاں ہیں تکلم کیا کیا
جب کبھی پہنچے سفینے کسی ساحل کے قریب
ناخداؤں نے اٹھائے ہیں تلاطم کیا کیا

زندگی کب ہے سازگار ہمیں
پھر بھی کم بخت سے ہے پیار ہمیں

مجھ کو دنیا کا تجربہ ہی نہیں
تجربے نے بتا دیا ہے مجھے

دشمنوں نے تو دشمنی کی ہے
دوستوں نے بھی کیا کمی کی ہے
لوگ لوگوں کا خون پیتے ہیں
ہم نے تو صرف مے کشی کی ہے

تکلف برطرف اے دوستو جب شام آتی ہے
نہ تقویٰ کام آتا ہے نہ توبہ کام آتی ہے

میں نے ہر غم خوشی میں ڈھالا ہے
میرا ہر اک چلن نرالا ہے
لوگ جن حادثوں سے مرتے ہیں
مجھ کو ان حادثوں نے پالا ہے

زلف وہ پرفسوں حقیقت ہے
جب بھی الجھی غمِ حیات بنی
جب بھی نکھری سیاہ رات بنی
جب بھی لہرائی کائنات بنی

شوق کی بے بسی نہیں جاتی
دل کی بیچارگی نہیں جاتی
آپ کو دیکھنا بھی مشکل ہے
آنکھ بھی بند کی نہیں جاتی

اپنی وحشت کی نمائش مجھے منظور نہ تھی
ورنہ دشوار نہ تھا چاکِ گریباں ہونا

کی نہیں عمر بھر خطا جس نے
اس نے توہینِ زندگی کی ہے
اہلِ دل نے ہمارے شعروں پر
واہ کے ساتھ آہ بھی کی ہے

کاملؔ چاندپوری

چار دن ترکِ مے پر یہ قائم رہیں مے گساروں کا کوئی بھروسہ نہیں
کب اٹھا دیں قدم میکدے کی طرف، غم کے ماروں کا کوئی بھروسہ نہیں
مہکی مہکی فضا، بہکی بہکی نظر، لڑکھڑاتی زبان، ڈگمگاتے قدم
جا رہے ہیں کدھر اور پہنچیں کہاں بادہ خواروں کا کوئی بھروسہ نہیں
رازِ دل تم کسی سے نہ کہنا کبھی ورنہ آئے گا وہ دن کہ پچھتاؤ گے
یہ چڑھا دیں گے رسوائی کی دار پر رازداروں کا کوئی بھروسہ نہیں

جن کو احساسِ ندامت بھی نہ ہوتا تھا کبھی — آج ان آنکھوں میں آنسو نظر آئے تو سہی
یہ الگ بات ہے پورے نہ ہوں وعدے کاملؔ — انکے وعدوں نے حسیں خواب دکھائے تو سہی

کسی کے عیب ٹٹولوں تو ایسا لگتا ہے — کہ جیسے کوئی مجھے آئینہ دکھاتا ہے

بڑی مشکل ہے راہِ راستی بھی — اگرچہ کوئی پیچ و خم نہیں ہیں

جنوں کی عمر خوبی سے گزار دی میں نے — مگر یہ ہوش کا لمحہ بلائے جاں گزرا

اسرار الحق مجاز

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

زندگی کیا ہے گناہِ آدم — زندگی ہے تو گنہ گار ہوں میں

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں — ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

حسنِ فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں	میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں
جس کو اپنی خبر نہیں رہتی اس زمیں کو زمیں ہی رہنے دے	اس کو سالارِ کارواں نہ بنا اس زمیں کو تو آسماں نہ بنا
کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے	قدم اپنا آگے بڑھائے چلا جا
تیرے گناہ گار گناہ گار ہی سہی	تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو	ترے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا	تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
یہ تو کیا کہیے چلا تھا میں کہاں سے ہمدم حسن اور عشق کو دے طعنۂ بے داد مجاز	مجھ کو یہ بھی نہ تھا معلوم کدھر جانا تھا تم کو تو صرف اسی بات پہ مرجانا تھا
یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے	یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

فیض احمد فیض

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے	کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے ہر ایک حلقۂ زنجیر پر زباں میں نے
یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر	وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک	جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے اک عرض تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا	وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و مال	محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں	چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

نہ کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر بچا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

گر آج مجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہونگے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں

جو مجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم بے حساب یاد آئے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

'نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں'
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں کہ نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بہ کو دلبر
انہیں پسند، انہیں ناپسند کیا کرتے

مجرم ہو خواہ کوئی رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم وراہ سوا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے چاہے جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

سچ ہے ہمیں کو آپ سے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم وراہ نہ کی

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوانہ تھے

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

مجروحؔ سلطانپوری

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

یہ محفلِ اہلِ دل ہے یہاں ہم سب میکش ہم سب ساقی
تفریق کریں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں
مجروح اٹھی ہے موجِ صبا آثار لئے طوفانوں کے
ہر قطرۂ شبنم بن جائے اک جوئے رواں کچھ دور نہیں

آخر غمِ جاناں کو اے دل بڑھ کر غمِ دوراں ہونا تھا
اس قطرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

سوال انکا جواب انکا سکوت انکا خطاب انکا
ہم انکی انجمن میں خم نہ کرتے سر تو کیا کرتے

نظارہ ہائے دہر بہت خوب ہیں مگر
اپنا لہو بھی سرخیٔ شام و سحر میں ہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجرِ فرنگ
سینے پہ زخمِ نو بھی ہے داغِ کہن کے ساتھ
مجروح قافلے کی مرے داستاں ہے یہ
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہ زن کے ساتھ

سرخیٔ مے کم تھی میں نے چھو لئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے
تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے
زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی ایک چراغ بجھا دیا کبھی ایک چراغ جلا دیا

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح
مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

جفا کے ذکر پر تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
پھاڑے ہونگے ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ
چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوقِ بہاراں تم سے زیادہ
عہدِ وفا یاروں سے نبھائیں نازِ حریفاں ہنس کے اٹھائیں
جب ہمیں ارمان تم سے سوا تھا اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ

یہی ہے جی میں کہ وہ رفتۂ تغافلِ ناز
کہیں ملے تو وہی قصۂ وفا کہیے
وہ ایک بات ہے کہیے طلوعِ صبحِ نشاط
کہ تابشِ بدن و شعلۂ حنا کہیے
وہ ایک حرف ہے کہیے اسے حکایتِ زلف
کہ شکوۂ رسن و بندشِ بلا کہیے
فسانہ جبر کا یاروں کی طرح کیوں مجروحؔ
مزہ تو جب ہے کہ جو کہیے برملا کہیے

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

اٹھنے کو تو اٹھ آئے ترے آستاں سے ہم
اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم

جاں نثار اختر

ہر ایک روح میں اک غم چھپا لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو کوئی بددعا لگے ہے مجھے

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود
ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان
تجھ کو دیکھوں تو مجھے پیاس لگے

ایک اک لہر کسی یگ کی کتھا
مجھ کو گنگا کوئی اتہاس لگے

ہمیں کو فرصتِ نظارگی نہیں ورنہ
اشارے آج بھی کرتی ہیں کھڑکیاں ہم سے

ہماری قدر کرواے سخن کے متوالو
غزل کو پھر نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے ابرو، ترے لب
اب بھی مشہور ہیں دنیا میں مثالوں کی طرح

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ شعر فقط ان کو سنانے کے لئے ہیں

اب یہ بھی نہیں ٹھیک کہ ہر درد مٹا دیں
کچھ درد کلیجے سے لگانے کے لئے ہیں

ان سے یہی کہہ آئیں کہ اب ہم نہ ملیں گے
آخر کوئی تقریب ملاقات بنے گی

یہ ہم سے نہ ہوگا کہ کسی ایک کو چاہیں
اے عشق ہماری نہ ترے ساتھ بنے گی

زلفیں، سینہ، ناف، کمر
ایک ندی میں کتنے بھنور

اب کیا کریں کہ حسنِ جہاں بھی عزیز ہے
تیرے سوا کسی پہ نہ پیار آئے یہ نہیں

جو ایک سمت گماں ہے تو ایک سمت یقیں
یہ زندگی تو یونہی درمیاں چلے ہے میاں

ان کی روش جدا ہے ہماری روش جدا
ہم سے تو بات بات پہ جھگڑا کیا نہ جائے

ہر چند اعتبار میں دھوکے بھی ہیں مگر
یہ تو نہیں کسی پہ بھروسہ کیا نہ جائے

لہجہ بنا کے بات کریں ان کے سامنے
ہم سے تو اس طرح کا تماشا کیا نہ جائے

اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے
سب کے عیبوں کو چھپایا ہے، بہت دن ہم نے

اور کیا ہے سیاست کے بازار میں
کچھ کھلونے سجے ہیں دکانوں کے بیچ

لوگ باتیں بنانے پہ ایسے تلے
چھپ گئی ہر حقیقت فسانے کے بیچ

منوررانا

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہونگے اے فلک
مجھ کو میری ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

قدم بڑھانے میں خطرہ ہے موت کا لیکن
میں لوٹتا ہوں تو سارا وقار جاتا ہے

عدالتوں ہی سے انصاف سرخرو ہے مگر
عدالتوں ہی میں انصاف ہار جاتا ہے

اب اس کو اتفاق ہی کہیے تو ٹھیک ہے
جتنے بھی خار تھے مرے دامن میں آ گئے

لوٹنے والے اسے قتل نہ کرتے لیکن
اس نے پہچان لیا تھا کہ بغل والے ہیں

بندھے ہوئے ہیں مرے ہاتھ پشت کی جانب
کہاں ہیں؟ آئیں پرانی عداوتوں والے

دوستی کا یہی تقاضہ ہے
اپنا الزام میرے سر ڈالو

بارش ہوئی تو جھوم کے سب ناچنے لگے
موسم نے پیڑ پودوں کو بھی مور کر دیا

میں وہ دیا ہوں جس سے لرزتی ہے اب ہوا
آندھی نے چھیڑ چھیڑ کے منہ زور کر دیا

نوجوانی میں مزہ آتا ہے چھت پر لیکن
عمر ڈھل جاہے تو زینہ بھی برا لگتا ہے

مہاجرو یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برامدوں میں رہا

اب دوست کوئی لاؤ مقابل میں ہمارے
دشمن تو کوئی قد کے برابر نہیں نکلا

اتنا روئے تھے لپٹ کر در و دیوار سے ہم
شہر میں آ کے بہت دن رہے بیمار سے ہم

اپنے بکنے کا بہت دکھ ہے ہمیں بھی لیکن
مسکراتے ہوئے ملتے ہیں خریدار سے ہم

سائباں ہو، ترا آنچل ہو کہ چھت ہو لیکن
بچ نہیں سکتے ہیں رسوائی کی بوچھار سے ہم

راستہ تکنے میں آنکھیں بھی گنوا دیں راناؔ
پھر بھی محروم رہے آپ کے دیدار سے، ہم

اسے بھی سربلندی پر ہمیشہ ناز رہتا ہے
ہمیں بھی آسمانوں کو زمیں کرنے کی عادت ہے

تمہارا کام ہے شہروں کو صحرا میں بدل دینا
ہمیں بنجر زمینوں کو حسیں کرنے کی عادت ہے

مسائل نے ہمیں بوڑھا کیا ہے وقت سے پہلے
گھریلو الجھنیں اکثر جوانی چھین لیتی ہیں

مرے واپس نہ آنے پر بہت سے لوگ خوش ہونگے
مگر کچھ لوگ میرا عمر بھر رستہ بھی دیکھیں گے

جاؤ جا کر کسی درویش کی عظمت دیکھو
تاج پہنے ہوئے پیروں میں پڑے رہتے ہیں

میں نے پھل دیکھ کے انسانوں کو پہچانا ہے
جو بہت میٹھے ہوں اندر سے سڑے رہتے ہیں

کسی بھی موڑ پر تم سے وفاداری نہیں ہوگی
ہمیں معلوم ہے تم کو یہ بیماری نہیں ہوگی

چلو چلتے ہیں مل جل کر وطن پر جان دیتے ہیں
بہت آسان ہے کمرے میں بندے ماترم کہنا

میاں رسوائی دولت کے تعاون سے نہیں جاتی
یہ کالک عمر بھر رہتی ہے صابن سے نہیں جاتی

عادتیں اب بھی ہیں اس کی وہی پہلے جیسی
صرف کپڑے وہ شریفوں کے پہن آیا ہے

دلاورؔ فگار

شیوۂ عشاق اب بازی گری بننے لگا
عشق جو اک آرٹ تھا انڈسٹری بننے لگا

امتحاں میں نقل کرنا ایک فائن آرٹ ہے
نقل کرتا ہے وہی جو واقعی اسمارٹ ہے

ذہن کی پستی سے پیدا جب بلندی ہوگئی
عقل مندی بڑھتے بڑھتے نقل مندی ہوگئی

یارب مرے نصیب میں اکلِ حلال ہو
کھانے کو قورمہ ہو کھلانے کو دال ہو

جنہیں روٹی نہیں ملتی وہ دس بچوں کے والد ہیں
یہ افلاس اور یہ جوشِ جوانی دیکھتے جاؤ

مفلسی، بھوک، مرض، عشق، بڑھاپا، اولاد
دل کو ہر قسم کا غم ہو تو غزل ہوتی ہے

بھوت، آسیب، شیاطین، اجنہ، ہمزاد
ان بزرگوں کا کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

صرف ٹھرے سے تو قطعات ہی ممکن ہیں فگار
ہاں اگر وہسکی و رم ہو تو غزل ہوتی ہے

وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی اشرف المخلوق ہے
آدمی کو دیکھ کر شیطان آدھا رہ گیا

ناپ کر دیکھا تو قد میں کچھ درازی آ گئی
تول کر دیکھا تو ہر انسان آدھا رہ گیا

چور صاحب آپ کو تکلیف تو ہوگی ضرور
یہ بھی لیتے جائیں جو سامان آدھا رہ گیا

شعر کا معیار آئندہ گلا رہ جائے گا
شعر گو کوئی نہ ہوگا، شعر گا رہ جائے گا

مرغ کی دعوت میں جب ڈونگا بڑھائے گا کوئی
نام کی بوٹی نہ ہوگی شوربا رہ جائے گا

صاحب یہ چاہتے ہیں میں ہر حکم پر کہوں
بہتر، درست، خوب، مناسب، بجا، ابھی

شاعروں کا اک عظیم الشان جلسہ تھا فگار
حاضرینِ بزم تھے اس بزم میں گنتی کے تین

اور ان تینوں کی یہ تفصیل بھی سن لیجئے
اک جناب صدر، اک سیکریٹری، اک سامعین

اے شہنشاہِ ترنم یہ ترنم کیا خوب
لوگ آواز کے جھٹکوں سے ہی ہل جائیں گے

یہ دعا مانگ سلامت رہے تیری آواز
رہ گئے شعر تو مانگے سے بھی مل جائیں گے

شاعر میں اور شعر میں یہ بحث چھڑ گئی
وہ بحث جس کا لطف اٹھائے ہوئے ہیں ہم

شاعر یہ کہہ رہا تھا کہ ہم نے کہا ہے شعر
اور شعر کہہ رہا تھا چرائے ہوئے ہیں ہم

فرمانِ وقت یہ ہے کہ اے صاحبانِ دل
آدابِ عقد کو بھی بدلتے ہوئے چلو

پہلے نکاح ہوتا تھا قاضی کی معرفت
اب صرف یہ کہ فون پہ کہہ دو ہلو ہلو

لب پہ یہ ہے چائے منگوالوں جو تم کو ہو پسند
دل میں یہ ہے ہاں نہ کر دے واقعی یہ ہوشمند

لب پہ یہ ہے بیٹھئے صاحب کئی دن بعد آئے
دل میں یہ ہے کاش یہ کمبخت فوراً بھاگ جائے

لب پہ یہ ہے انشاءاللہ کل ضرور آؤں گا میں
دل میں یہ ہے کل بھی اس وعدے کو دہراؤں گا میں

وزیرِ جنگ یہ فرما رہے تھے
ہمارے پاس ایٹم بم نہیں ہے

کوئی لڑکی کہیں سے بول اٹھی
نگاہِ ناز بھی کچھ کم نہیں ہے

ناصرؔ کاظمی

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

جز دل کوئی مکان نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ رہے در کھلا بھی ہو

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد
آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائیگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں

آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصرؔ
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے یہ کیاریاں
کس کی مجال ہے یہ چمن مجھ سے چھین لے

ناصرؔ کیا کہتا پھرتا ہے کچھ نہ سنو تو بہتر ہے
دیوانہ ہے دیوانے کے منہ نہ لگو تو بہتر ہے

کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے کل مٹ جائیگا
روکھی سوکھی جو مل جائے شکر کرو تو بہتر ہے

کیا جانے کیا رت بدلے حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے

کپڑے بدل کر، بال بنا کر، کہاں چلے ہو، کس کیلئے
رات بہت کالی ہے ناصرؔ گھر میں رہو تو بہتر ہے

رونا آتا ہے ہمیں بھی لیکن
اس میں توہینِ وفا ہوتی ہے

تری گلی میں بہت دیر سے کھڑا ہوں مگر
کسی نے پوچھ لیا تو جواب کیا دوں گا

حال کس سے کہوں کہ ہر کوئی
اپنی اپنی سنائے جاتا ہے

چلے تھے اور کسی راستے کی دھن میں مگر
ہم اتفاق سے تیری گلی میں آ نکلے

غمِ فراق میں کچھ دیر رو بھی لینے دو
بخار کچھ تو دلِ بے قرار کا نکلے

ذرا سنو تو سہی کان دھر کے نالۂ دل
یہ داستاں نہ ملے گی تمہیں کتابوں میں

تمام عمر یونہی ہم نے دکھ اٹھایا ہے
زیادہ خرچ کیا اور کم کمایا ہے

احمد فراز

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
یا دل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

ہم تو بدنامِ محبت تھے سو رسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے

کوں طاقوں پہ رہا کون سرِ راہ گذر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

ہم سفر چاہیے ہجوم نہیں
اک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

دل کو سوجھا تو ہے مضموں تری خوش قامتی کا
ہم سے کوتاہ بیانوں سے ادا ہو کہ نہ ہو

سقراط نہ تھا پہ سچ کی خاطر
پیتا رہا زہر پیشتر بھی

منصور و مسیح گو نہیں تھا
ہر عہد میں تھا صلیب پر بھی

انصاف کہاں اب تو فقط فیصلہ ہوگا
میں پا بہ سلاسل، کفِ دشمن میں قلم ہے

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ میرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

رفتہ رفتہ ہی وہ زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سنایا اسے فسانہ لگا

اس عہدِ ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں اک زمانہ لگا

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی	بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا
تیور تھے بے رخی کے، انداز دوستی کے	وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا
اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز	واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے
دیکھا مجھے تو ترکِ تعلق کے باوجود	وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا
اسکی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح	میری سوچیں بھی پریشان مرے بالوں جیسی
ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی	تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے
میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی	ترے لئے مرے دل سے دعا نکلتی ہے
وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجے	کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے
فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں	مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں
سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی	وہ خوش مزاج اگر تھا تو میں بھی نہ تھا
اب احتیاط کی دیوار کیا اٹھاتے ہو	جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

قتیل شفائی

چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیل	جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا
نورِ جہاں کوئی نہ کوئی یوں تو سب کی تھی	دولت سے ایک شخص جہاں گیر ہو گیا
کرتا رہا جو روز مجھے اس سے بدگمان	وہ شخص بھی اب اس کا تمنائی بن گیا
تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں	ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم	دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا	جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا	وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

کبھی نہ ختم ہوئیں گو شکایتیں اپنی
اسی عروج پہ ہیں اب بھی چاہتیں اپنی

اپنی حدوں میں رہیے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالئے

وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

کمندیں ڈالنے آئے تھے جو بامِ ثریا پر
وہی اب سایۂ دیوار سے آگے نہیں جاتے

ہمیں بھی دانۂ گندم نے کر دیا رسوا
اگر چہ دہر میں جنت کا اہتمام نہیں

مولانا محمد علی جوہر

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو
ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈ کے سب تھک گئے اسے
اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے
یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا
جو ہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں تیری آرزو نہ ہو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کم ترین کی

ایک اک کر کے سب کے سب تنکے
ہوئے برباد آشیانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

یقیں آنے کو تو آ جائے تیرے عہد و پیماں پر
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

ارادہ ہے طواف کعبہ کا اس آفت جاں کا
خدا حافظ مسلمانو تمہارے دین وایماں کا

ہم کو خود شوقِ شہادت ہے گواہی کیسی
فیصلہ جلد کرو مجرمِ اقراری کا

تمہارے فضل کے بھوکے یقین رکھتے ہیں
کہ عید آئے گی بے شک مہ صیام کے بعد

تمہیں کرو سرِ تسلیم پہلے خم پے قتل
کہ جھکائے ہیں سبھی مقتدی امام کے بعد

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخ کہن سے دور

آدمیت ہی تو بنیاد ہے ہر خوبی کی
ہو نہ یہ بھی تو دھرا کیا ہے پھر انسان کے پاس

خواہشیں نفس کی کرتے تو ہو پوری لیکن
اس سے بہتر کوئی آلہ نہیں شیطان کے پاس

ہمت نہ ہار دے کوئی منزل کے سامنے
پروردگاریوں بھی کوئی ناتواں نہ ہو

ہوں لائقِ تعزیر ہر الزام ہے جھوٹا
مجرم تو ہوں بے شک پہ خطا اور ہی کچھ ہے

آج کرلو جو کرسکو، کل تک
کون جیتا ہے، کون مرتا ہے

قلزم عشق میں گرا سو گرا
اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے

اس قدر احتیاط اے صیاد
کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے

ساحرلدھیانوی

اہلِ دانش نے جسے امر مسلم جانا
اہلِ دل کیلئے وہ بات عجیب آج بھی ہے

تم میرے لئے اب کوئی الزام نہ ڈھونڈو
چاہا تھا تمہیں اک یہی الزام بہت ہے

جب کبھی ان کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دہرائی گئی

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بندِ قبا کی بات کریں

ہر ایک دور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
اداس کیوں ہو جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل لیکن
ترے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں

ستم کے بہت سے ہیں ردِ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجئے

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہش بال و پر کیجئے

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگتے ہیں عجیب سے

اس طرح زندگی نے ہمارا دیا ہے ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
کب ہوا ہے یہاں کسی کا قیام

نسل در نسل کام جاری ہے
کارِ دنیا کبھی ہوا نہ تمام

کل جہاں میں تھا آج تو ہے وہاں
اے نئی نسل تجھ کو میرا سلام

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جسمیں نہ دل شریک ہو اس لے میں کچھ نہیں

نغمہ جو ہے تو روح میں ہے نے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں تو کسی شئے میں کچھ نہیں

یہ زمیں جس قدر سجائی گئی
زندگی کی تڑپ بڑھائی گئی

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جس کی صورت جنہیں دکھائی گئی

دشمنوں ہی سے بیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ توڑ لینے کی نوبت تو آئے

ہم قیامت کے خود منتظر ہیں پر کسی دن قیامت تو آئے

ایک تہذیب ہے دوستی کی ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروت نہ سیکھی، دشمنوں کو عداوت تو آئے
علم و تہذیب، تاریخ و منطق، لوگ سوچیں گے ان مسئلوں پر
زندگی کے مشقت کدے میں کوئی عہدِ فراغت تو آئے

کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

گو مسلکِ تسلیم و رضا بھی ہے کوئی چیز
پر غیرتِ اربابِ وفا بھی ہے کوئی چیز
یہ بے رخیِ فطرتِ محبوب کے شاکی
اتنا بھی نہ سمجھے کہ ادا بھی ہے کوئی چیز
عشرت کدۂ دہر میں اے تارکِ دنیا
لذت کدۂ جرم و خطا بھی ہے کوئی چیز

عکسِ مے ہو کہ جلوۂ گل ہو
رنگِ رخسار تک نہیں پہنچا

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کو جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں مانتے ہیں

میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم، حسیں باہیں ہیں
سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس کی جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
آنچل سے سینے چھپاتی
جشن مناؤ سالِ نو کے

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

تعارف روگ ہو جائے تو اس کا بھولنا اچھا
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا اچھا

مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائیگاں کر لوں

وجہ بے رنگیِ گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گنہ گار کہوں تو کیا ہو

تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

فقیر شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

ستم کے دور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ

سازشیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کے نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

تھے جنہیں سب سے زیادہ دعویِ حب الوطن
آج ان کی وجہ سے حب وطن رسوا تو ہے

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے

خون اپنا ہو یا پرایا ہو	نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں	امنِ عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر	روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے	زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں	کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ	زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے	جنگ کیا مسئلوں کا حل ہوگی
اس لئے اے شریف انسانو	جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں	شمع جلتی رہے تو بہتر ہے
جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی	اس عہدِ سیاست کو مظلوموں کا غم کیوں ہو
غالب جسے کہتے ہیں اردو ہی کا شاعر تھا	اردو پہ ستم ڈھا کر غالب پہ کرم کیوں ہو
گاندھی ہو یا غالب ہو	دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئی	ایک کی شکشا اک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن	آؤ انہیں اب کر دیں دفن
ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف	گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی
دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں	جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

خمارؔ بارہ بنکوی

حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمارؔ	کیا بات ہو گئی جو خدا یاد آ گیا
ہم بھی کر لیں جو روشنی گھر میں	پھر اندھیرے کہاں قیام کریں

مجھ کو محرومیِ نظارہ قبول
آپ جلوے نہ اپنے عام کریں
اک گذارش ہے حضرتِ ناصح
آپ اب اور کوئی کام کریں

روشنی کے لئے گھر جلانا پڑا
ایسی ظلمت بڑھی تیرے جانے کے بعد
رنج حد سے گذر کر خوشی بن گیا
ہو گئے پار ہم ڈوب جانے کے بعد

غم تو ہے عین زندگی لیکن
غم گساروں نے مار ڈالا ہے
دیکھ کر برق کی پریشانی
آشیاں خود ہی پھونک ڈالا ہے
کتنے اشکوں کو، کتنی آہوں کو
اک تبسم میں اس نے ڈھالا ہے
موت آئے تو دن پھریں شاید
زندگی نے تو مار ڈالا ہے

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

دشمنوں سے پیار ہوتا جائے گا
دوستوں کو آزماتے جایئے

دل بھر آئے تو مسکرا دینا
یہ ہنر سب کے بس کی بات نہیں
دل بجھا ہو اگر تو دن بھی ہے رات
دل ہو روشن تو رات رات نہیں
حال اپنا سناؤں کیا تم کو
قابلِ ذکر کوئی بات نہیں

کرم وہ مجھ پہ کئے میرے دوستوں نے خمارؔ
میں کہہ اٹھا کہ مجھے دوستی قبول نہیں

دوست ہوتے جو وہ تو کیا ہوتا
دشمنی پر جب اتنے پیارے ہیں

حد سے بڑھے تو علم بھی ہے جہل دوستو
سب کچھ جو جانتے ہیں وہ کچھ جانتے نہیں

صحرا کو بہت ناز ہے ویرانی پہ اپنی
واقف نہیں شاید مرے اجڑے ہوئے گھر سے

کیا بلا ہے خوشی خدا جانے
ہم تو بس نام سنتے آئے ہیں
مہربانی، خلوص، ہمدردی
ہم نے کیا کیا فریب کھائے ہیں
فاصلے اور بڑھ گئے ہیں خمارؔ
جب کبھی وہ قریب آئے ہیں

خدا بچائے تری مست مست آنکھوں سے　فرشتہ ہو تو بہک جائے آدمی کیا ہے

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجئے　سامنے آئنہ رکھ لیا کیجئے

آپ سکھ سے ہیں ترکِ تعلق کے بعد　اتنی جلدی نہ یہ فیصلہ کیجئے

زندگی کٹ رہی ہے بڑے چین سے　اور غم ہوں تو وہ بھی عطا کیجئے

اب قیامت سے کیا ڈرے کوئی　اب قیامت تو روز آتی ہے

موت بھی اتنی تلخ نہیں　دوستوں کے احسان سے ڈر

کاش لفظوں میں بھی ہوسکتا بیاں　آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے آج کل

یہ کہنا تھا ان سے محبت ہے مجھ کو　یہ کہنے میں مجھ کو زمانے لگے ہیں

قیامت یقیناً قریب آ گئی ہے　خمارؔ اب تو مسجد میں جانے لگے ہیں

الٰہی مرے دوست ہوں خیریت سے　یہ کیوں گھر میں پتھر نہیں آ رہے ہیں

ڈوبا ہو جب اندھیرے میں ہمسائے کا مکان　اپنے مکاں میں شمع جلانا گناہ ہے

شمع کیا، چاند کیا، ستارے کیا　سلسلے سب کے تیرگی سے ملے

کہیں شعر و نغمہ بن کے کہیں آنسوؤں میں ڈھل کے　وہ مجھے ملے تو لیکن ملے صورتیں بدل کے

یہ وفا کی سخت راہیں یہ تمہارے پائے نازک　نہ لو انتقام مجھ سے مرے ساتھ ساتھ چل کے

خوف خدا نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی　کوئے بتاں میں ٹھوکریں کھانے کے دن گئے

اک آنسو کہہ گیا سب راز دل کا　میں سمجھا تھا یہ ظالم بے زباں ہے

اٹھ کے اک بے وفا نے دے دی جان　رہ گئے سارے باوفا بیٹھے

شادؔ عظیم آبادی

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی　خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

کوئی صہبا کشی میں طاق کوئی مے پرستی میں
خراباتِ مغاں میں جمع ہے استاد ہر فن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پائے زخمی سے
کبھی بھولے سے دل توڑا نہ ہم نے اپنے دشمن کا

نکل آئے ہم آخر ڈوب کر دریائے ہستی سے
کوئی کونا تو کیا اک تار بھی بھیگا نہ دامن کا

شناسائی بہت آساں ہے اپنے دوست کی ناداں
بہت دشوار ہے پہچاننا انساں کو دشمن کا

سن چکے جب حال میرا لے کے انگڑائی کہا
کس غضب کا درد ظالم تیرے افسانے میں تھا

خود غرض دنیا کی حالت قابلِ عبرت تھی شادؔ
لطف ملنے کا نہ اپنے میں نہ بیگانے میں تھا

پیری میں جوانی کی باتیں کیا عرض کروں اک قصہ ہے
وہ طرز گئی، وہ وضع گئی، انداز گیا، اسلوب گیا

ہزار شکر میں تیرے سوا کسی کا نہیں
ہزار حیف کہ اب تک ہوا نہ تو میرا

یونہی صبح ہوگی یونہی شام ہوگی
یہی رات دن کا تماشا چلے گا

بہت کم تھا جو دیکھ کر ہم چلے ہیں
وہ دیکھے گا سب کچھ یہاں جو رہے گا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا
چشمِ تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

داغ ہو، یا سوز ہو، یا دردو غم
لے لیا خوش ہو کے جس نے جو دیا

دل کی پروا تک نہیں اے بے خودی
کیا کیا، پھینکا کہاں، کس کو دیا

کچھ نہ کچھ اس انجمن میں حسبِ حال
تو نے قسامِ ازل سب کو دیا

کھو گئے ہیں دونوں جانب کے سرے
کون اب یہ گتھیاں سلجھائے گا

سبق تو مکتبِ دنیا میں سب کا تھا یکساں
کسی کو شکر، کسی کو فقط گلہ آیا

یونہی موت وحیات و روز و شب کا سلسلہ ہوگا
وہی ہوگا جواب تک ہو رہا ہے اور کیا ہوگا

ہر اک کلام پہ صدّقت اے زباں کہہ دے
کہ حسنِ یار کسی کی نہیں نہیں سنتا
پکارنے کی طرح اے پکارنے والے
پکارتا اگر اس کو تو بالیقیں سنتا

ہوئی نہ نزع کی سختی نہ حال غیر ہوا
ترے مریض کا یوں خاتمہ بخیر ہوا

کسی کو حسن دیا اور کسی کو مال دیا
غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا
نہیں وجود کسی جا اسی لئے میں نے
وفا کا لفظ کتابوں سے بھی نکال دیا

نہ پوچھو مفتیانِ شرع کا احوال جانے دو
تنفر کفر سے جس کو ہو وہ اسلام کیا ہوگا

میں جو حاصل ترے کوچے کی گدائی کرتا
بندگی کہتے ہیں کس شئے کو خدائی کرتا

فلک نے داب دیے خاک میں ہنر کیا کیا
زمیں نے کھا لئے پھولے پھلے شجر کیا کیا
ہمارا جام ہے لبریز ہم کو کیا پروا
کہ مچ رہا ہے زمانے میں شور و شر کیا کیا
جو مرنے والے بتاتے تو پوچھتا اے شاؔد
کہ نفع مرنے میں کیا کیا ہے اور ضرر کیا کیا

ہو کے خوش ناز ہم ایسوں کے اٹھانے والا
کوئی باقی نہ رہا اگلے زمانے والا

جفا و ظلم کا شکوہ بہت کچھ اے قاصد
لکھا تو تھا مگر اس خط کو میں نے پھاڑ دیا

تری گلی میں جو پہنچا تو سب غلط پایا
دیا گیا تھا مکرر جہاں جہاں کا پتا
جلا کے خاک کریں دل کو، خاک کو برباد
وہ اپنے مال کے مختار ہیں تمہارا کیا
ہزار حیف کہ اب تک پتہ نہ اس کا لگا
کہ ناگوار تجھے کیا ہے اور گوارا کیا

گذری جہاں آرام سے بلبل کی ساری زندگی
وہ شاخ ہے اب اور کی، وہ آشیاں ہے اور کا

جب اختیار چمن پر نہیں تو ہم کو کیا
ہزار بار اگر موسمِ بہار آیا

جو گھر بنایا تو اب ڈر ہے اس کے گرنے کا
وبال سر پہ عبث تو نے اے مکین لیا

جس کا دل مرجھا چکا ہو غم سے اس کمبخت کو
پھول گر پھولے تو کیا، ابرِ بہار آیا تو کیا

سب جسم چاک چاک ہے اے ناخنِ جنوں — یہ پیرہن رفو کے بھی قابل نہیں ہے اب

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم — آسماں بدلا، زمیں بدلی، نہ بدلی خوئے دوست

ذکر پیری میں کیا جوانی کا — جا چکی جب کے ساتھ جب کی بات

اس میں ہے اختیار مان نہ مان — سن لے تو کان دھر کے سب کی بات

عزیز ایسے گئے آنکھیں پھرا کر — ملے پھر خواب تک میں بھی نہ آ کر

سزا ہے ہوش میں آنے کی اے دل — بس اب ناصح کہے اور تو سنا کر

تعلق میں نہ پھنس دل کو لگا کر — تجھے آنا نہیں دنیا سے جا کر

غرض کا اپنی بندہ ہو کے ناحق جانور بننا — خصائل آدمی کے کچھ تو اے انسان پیدا کر

ہمدرد ہے کون اور کون عدو، ہے کس میں خلوص اور کس میں ریا
افسوس اس ادنیٰ بات کی بھی آئی نہ تجھے پہچان ہنوز

نہ خوشی سے خوش ہے نہ غم سے خوش، نہ مکاں سے خوش، نہ مکیں سے خوش
وہ خدا نے ہم کو دیا ہے دل، کہ نہ آسماں نہ زمیں سے خوش

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

بابِ قبول تک گئی کوئی دعا نہ آج تک — سچ تو یہ ہے ذلیل ہیں بزمِ جہاں میں سب سے ہم

خیال سے ہے کہیں دور آستانہ دوست — وہاں کا شوق ہے دل کو جہاں رسائی نہیں

فراق کی جاں گزا مصیبت، وصال کا دے رہی ہے مژدہ
ضرر کا پہلو ہے نفع میں جب، تو نفع کیونکر نہ ہو ضرر میں

ذی جوہروں کے واسطے لازم سکوت ہے — کچھ اپنے منہ سے لعل و گہر بولتے نہیں

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر — کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

ان سوالات کا پایا نہ کہیں ہم نے جواب
کیا ہیں کس واسطے ہیں، کون ہیں، کیونکر ہم ہیں

ہجر کے بعد اگر ہے وصل تب تو کوئی الم نہیں
رحم ہے جس کی انتہا پھر وہ ستم ستم نہیں

ایسا نہیں ہے پہلے سے وہ جانتے نہیں
کچھ عرض جب سے کی مجھے پہچانتے نہیں

جو کام بن پڑا وہ کیا ہم نے وقت پر
پہلے سے دل میں بات کوئی ٹھانتے نہیں

ظاہر نہ ہوں تو دیدۂ بینا کا ہے قصور
ذرے بھی اپنی اپنی جگہ آفتاب ہیں

کہوں کیا تجھ سے میں اے باغباں کیا ہوں مگر اتنا
جسے پھولا پھلا کاٹا ہے تو نے وہ شجر ہوں میں

خوشی میں ہوں میں خوش اے شاؔد اور غم میں ہوں میں غمگیں
فرشتوں کا نہیں لایا ہوں دل آخر بشر ہوں میں

کہنے لگتے ہیں جوانی کی کہانی جو کبھی
پہلے ہم دیر تلک بیٹھ کے رو لیتے ہیں

جب کہ شکلیں ہیں جدا، رنگ جدا، روپ جدا
متفق سب کے خیالات ہوں امکان نہیں

کھل سکا جس کا نہ اب تک حال ہوں وہ مدعا
جس کا مطلب کچھ نہیں معلوم وہ مقصود ہوں

جل رہا ہوں اک زمانے سے کوئی واقف نہیں
ہے دھواں معدوم میرا آتشِ بے دود ہوں

شب برات، شب عید، سب شبیں ہیں مگر
شب وصال فقط دور آسماں میں نہیں

اسی سے شہد کی مکھی کی طرح جا لپٹے
وفا کی بو نظر آئی ہمیں ذرا جس میں

بد عہد وہی بلکہ دل آزار وہی ہیں
سب کچھ ہیں مگر پھر مرے غم خوار وہی ہیں

اللہ رے تعلق جو کبھی پاتے ہیں آہٹ
کہتے ہیں کہ بے شک پسِ دیوار وہی ہیں

بیٹھے ہیں جو کوچے میں ترے بند کئے آنکھ
سچ پوچھئے تو طالب دیدار وہی ہیں

ہے جگر میں کچھ دنوں اور کچھ دنوں دل میں قیام
چھوڑ کر اپنا محلہ جائے بربادی کہاں

جو غم سے چور ہو وہ کیا غزل کہے اے شاؔد
ہزار اس کی طبیعت اگر رسا بھی ہو

درِ فیض سے آپ ہی کے ملا ہے	شہنشاہ کو تاج کاسہ گدا کو
ہے مجرم میری پیری شاؔد دنیا کا گلہ کیسا	میں اس سے ہٹتا جاتا ہوں وہ مجھ سے ہٹتی جاتی ہے

آنکھوں سے سدھاری بینائی، سننے سے معطل گوش ہوئے
جب ہوش تھے تب مدہوش رہے جب ہوش نہیں تب ہوش ہوئے

گلوں نے خاروں کے چھیڑنے پر سوا خموشی کے دم نہ مارا
شریف الجھیں اگر کسی سے تو پھر شرافت کہاں رہے گی

سوچ کر اور جی کو کھونا ہے	ہو رہے گا وہی جو ہونا ہے
حضرتِ واعظ بدل کر بھیس مے خانے گئے	کوئی دھوکے میں نہ آیا اور پہچانے گئے
رہ گئے گم نام وہ شہرت کو جو قابل نہ تھے	مان لینے کے جو لائق تھے وہی مانے گئے
نہ مصلےٰ کی ضرورت ہے نہ منبر درکار	جس جگہ یاد کریں تجھ کو وہی مسجد ہے
مشقت کے سوا کیا مل گیا مشقِ سخن کر کے	عدو چاروں طرف پیدا کیے ہم نے یہ فن کر کے

نہ خوش زمیں سے نہ آسماں سے خدا ہی جانے ملال کیا ہے

ہمیں یہ ظاہر نہیں ہے اب تک کہ خود ہمارا خیال کیا ہے

اب اجتناب مناسب ہے شاؔد رندی سے	سفید آپ کی داڑھی کے بال ہونے لگے
مکتب میں عاشقی کے پہلا سبق یہی ہے	جو میں کہوں وہ باطل جو تو کہے وہ حق ہے
مجھ سے کسی نے یہ بھی پوچھا نہ اس گلی میں	کیوں پھر رہے ہو مضطر، کس بات کا قلق ہے
ناصح کتابِ الفت ہم پڑھ کے کیا کریں گے	ہم عاشقوں کو از بر اس کا ہر اک ورق ہے
جو مرض ہو کوئی دوا کرے، جو بلا کوئی ہو دعا کرے	جو دوا دعا میں اثر نہ ہو تو بتائیے کہ وہ کیا کرے
قدرِ ہنر تھی جس سے وہ اہلِ ہنر گئے	یہ دور اور ہے وہ زمانے گزر گئے
جنگل کو باغ، باغ کو جو خلد کر گئے	کیوں اے صبا وہ پھول چمن سے کدھر گئے

وطیرہ ہے یہی دنیا کا اس سے جی نہ چھوڑ اے دل
برائی پیٹھ پیچھے روبرو تحسین ہوتی ہے

قمر کو داغ، فلک کو زمین، رات کو دن
اسی پہ کیا ہے وہ جو کچھ کہیں بجا کہیے
کہوں جو کچھ تو اشارہ یہ ہے کہ روک زباں
رہوں خموش تو کہتے ہیں مدعا کہیے

پانی ہوئے کہ خاک ہوئے یا ہوا ہوئے
اے دل ابھی جو بول رہے تھے وہ کیا ہوئے

یارب نہ ہو تمام محبت کی داستاں
کوئی کہا کرے کوئی بیٹھا سنا کرے
گذرا میں آرزو سے غنیمت ہے مجھ کو یاس
جو آپ چاہتے ہیں وہی ہو خدا کرے

دل یہ چلاتا ہے نکلی نہیں حسرت میری
عمر کہتی کہ ہے چپ ختم ہے مدت میری

بظاہر مدح کے قابل ہیں سب سامان دنیا کے
مگر اس پر بھی دل سے خوش نہیں مہمان دنیا کے
اگر دنیا کا طالب ہے تو کر قابو میں دنیا کو
مگر تو خود نہ آ قابو میں تا امکان دنیا کے
بری باتیں تری مشہور ہوتی ہیں تو کیا پروا
جو ممکن ہو تو اٹھ کر بند کر دے کان دنیا کے

بشیر بدر

شام تک میلہ ہے پاگل پیڑ پنچھی کس کے میت
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اپنا ٹیپ بجا کر کو اسنتا ہے
سب کو اپنی بولی اچھی لگتی ہے

ٹیڑی تہذیب، ٹیڑی فکر و نظر
ٹیڑی غزلیں سنا رہے ہیں ہم

تفصیل کیا بتائیں ہمارے بھی عہد میں
تعداد شاعروں کی وہی پونے تین ہے

دنیا ہے بے پناہ تو بھرپور زندگی
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

دل کی بستی پرانی دلی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

تیرے اور میرے پیار میں اکثر سارے جذبات مشترک ہیں مگر
دھوپ کتنی ہی مہرباں ہو جائے یہ کبھی چاندنی نہیں ہوتی

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو	نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے	
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی	یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا	

متفرقات

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے	پسینہ پوچھیے اپنی جبیں سے	امراؤ مرزا انور
لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں	کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی	میر محبوب علی خان
یادِ ماضی عذاب ہے یا رب	چھین لے مجھ سے حافظہ میرا	اختر انصاری
قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا		امیر مینائی
شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن	مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا	محمد یار خان امیر
کیا خوب برق تو نے دکھایا ہے زورِ طبع	کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر	لالہ رام رکھا برق
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے	کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی	میر حسن
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے	جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے	
مٹھیوں میں خاک لیکر لوگ آئے وقت دفن	زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے	ثاقب لکھنوی
نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں	وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں	جلیل مانکپوری
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا	تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں	جوہر فرخ آبادی
نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر	اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی	جوہر فرخ آبادی
اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں	وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا	جوہر فرخ آبادی
ہم عشق سے واقف کیا واقف ہیں تو بس اتنا	آغاز ہلاکت ہے انجام خدا جانے	جوہر فرخ آبادی
آخر گل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی	پہنچی وہیں خاک جہاں کا خمیر تھا	جہاں دار شاہ

غیروں سے کہا تمنے غیروں سے سنا تمنے	کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا	چراغ حسن حسرت
برس پندرہ یا سولہ کا سن	مرادوں کی راتیں جوانی کے دن	میر حسن
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں	گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں	میر حسن
کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں	سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں	میر حسن
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے	ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے	حفیظ جونپوری
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے	دل ٹوٹے آواز نہ آئے	حفیظ میرٹھی
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں	ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں	نامعلوم
پیری میں ولولے وہ کہاں ہیں شباب کے	اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے	خوشوقت علی خان
آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں	تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل	سید محمد خان
کیا ملا عرض مدعا کر کے	بات بھی کھوئی التجا کر کے	سید محمد خان
مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے	بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے	ریاض خیرآبادی
مر گیا ہوں یہ تعلق جو ہے میخانے سے	میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے	ریاض خیرآبادی
نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی	قرض پی آئے اک دکان سے آج	ریاض خیرآبادی
وہی ریاض جو تھے بت پرست بادہ پرست	خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے	ریاض خیرآبادی
بڑے صاف طبیعت بڑے پاک باطن	ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں	ریاض خیرآبادی
اب جوانی کو رو رہے ہیں ریاض	قدر نعمت ہوئی زوال کے بعد	ریاض خیرآبادی
حال دل سنکے وہ آزردہ ہیں شاید انکو	اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے	عبدالمجید سالک
ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا	پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی	سید محمد میر سوز

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے — مرزا صادق شرر

موت سے کس کو رستگاری ہے	آج وہ کل ہماری باری ہے	حکیم شوق
طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ	دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں	نواب شیفتہ
آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں	ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی	جفا
چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں	کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں	منشی صفا

کوئی کیوں کسی سے لگائے دل کوئی کیا کسی کا لبھائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا — سراج الدین ظفر

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار	اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں	ظہیر الدین ظہیر
صرف اک قدم اٹھا غلط راہِ شوق میں	منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی	عبدالحمید عدم
گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں	وہ طفل کیا گریں گے جو گھٹنوں کے بل چلیں	عظیم بیگ عظیم
چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم کی نکلے	عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے	مرزا ابجو فدوی
عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم	رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے	قمر بدایونی
اچھی صورت بھی کیا بری شئے ہے	جس نے ڈالی بری نظر ڈالی	کیف ٹونکی
دردِ سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید	اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے	الٰہی بخش معروف
دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار	جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی	منشی موجی رام
سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے	کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے	ناسخ
کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت	جسمیں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے	سیّد احمد

لائے اس بت کو التجا کر کے	کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے	پنڈت دیا شنکر نسیم
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے	جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے	پنڈت دیا شنکر نسیم
اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے	اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر	خواجہ محمد وزیر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو	کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو	خواجہ محمد وزیر
مفلسی سب بہار کھوتی ہے	مرد کا اعتبار کھوتی ہے	ولی اورنگ آبادی
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی	ہاں مگر چین سے بسر نہ ہوئی	یاور بریلوی
ملے گی شیخ کو جنت ہمیں دوزخ عطا ہوگا	بس اتنی بات ہے جس کیلئے محشر بپا ہوگا	ہری چند اختر
داستانِ شبِ غم قصہ طولانی ہے	مختصر یہ ہے کہ تو نے مجھے برباد کیا	جذبی
تھمتے ہی تھمے گا اشک ناصح	رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے	قلندر
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا	ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے	ثاقب لکھنوی
داورِ محشر مرا نامہ اعمال نہ دیکھ	اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں	محمد دین تاثیر
آپ کی میری کہانی ایک ہے	کہیے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں	میکش اکبرآبادی
سب نہ ملنے تک کی باتیں تھیں جب آ کر مل گئے	سارے شکوے مٹ گئے سارا گلہ جاتا رہا	اختر شیرانی
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش معلوم ہوتی ہے	بہت ممکن ہے کل اسکا محبت نام ہو جائے	شعری بھوپالی
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے	الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم	اسرار الحق مجاز
ان سے سمجھوتے پہ دل مائل نہیں	ہم ادھوری بات کے قائل نہیں	وامق جونپوری
ان کی معصوم اداؤں پہ نہ جانا اے دل	سادگی میں بھی قیامت کا فسوں ہوتا ہے	آل احمد سرور
کام اب کوئی نہ آئیگا بس اک دل کے سوا	راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا	علی سردار جعفری
یوں ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے	لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے	خاطر غزنوی
اب تو آرام سے گذرتی ہے	عاقبت کی خبر خدا جانے	شاہ عالم آفتاب

جسکے غم میں ہم کبھی آرام سے واقف نہیں	کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں	محمد اسحٰق تمنا
ذکر اس زلف کی درازی کا	صبح سے تا بہ شام ہوتا ہے	جان علی جان
وہ کافر مرا درد کیا جانتا ہے	جو گذرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے	جہانگیر بیگ
نازک دلوں کے زخم کو مرہم کبھو نہ ہو	پیراہنِ حیات پھٹے تو رفو نہ ہو	جعفر علی حسرت
جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے	ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں	غلام حسن
چاندنی کی سیر کو کس طور نکلے وہ صنم	دیکھنے مہ کا تماشا آفتاب آتا نہیں	داؤد
میں ہی کچھ تنہا نہ اس کو دیکھ مفتوں ہو گیا	ہر کوئی اس غیرتِ لیلیٰ کا مجنوں ہو گیا	مرزا مغل سبقت
سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے	مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے	محمد میر سوز
چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا	دن گیا، رات گئی، رات گئی، دن آیا	نذیر الدین شائق
شام کو جب یاد تیری بات آتی ہے مجھے	نیند کافر ہوں جو ساری رات آتی ہے مجھ	محمد شفیع
مدت سے یہ بحث درمیاں سے	پر علم نہیں کمر کہاں ہے	حسن خان شوق
برقع کو اٹھا منہ سے جو تم کرتے ہو باتیں	اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم	میر صفدر علی
چیر ہے سینے کو شق کی ہے دلِ دلگیر کو	یہ ہی دو جا گہ ہیں اور کیا کھا گیا میں تیر کو	حافظ طالب
ان بھی جور و جفا سے ہوئے خوگر اب ہم	چاہیے اب ستمِ نو کوئی ایجاد کرو	میر محمدی ظاہر
شب فراق میں دل پر قلق ابھی سے ہے	سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے	
میں لکھ چکا ہی نہیں حال دل کہ اسکی طرف	ہوائے شوق میں اڑتا ورق ابھی سے ہے	
ہنوز دفن ہوا بھی نہیں مرا بسمل	کہ زلزلے میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے	
کسی نے شام کو آنے کو کیا کہا عشرت	کہ پھولی آپ کے منہ پر شفق ابھی سے ہے	غلام علی عشرت
پیر مے خانہ یہی کہتا ہے ہر اک رند کو	صحبتِ زاہد سے جتنا ہو سکے پرہیز کر	میر یعقوب عیاش
تصور میں ہوں اس سے دو بدو ہم	کیا کرتے ہیں پہروں گفتگو ہم	غضنفر علی خان

کھینچی دیکھی جو کل تصویرِ مجنوں	تو گویا بیٹھے ہیں بس ہو بہو ہم	غضنفر علی خان
لایا یوسف کا دکھانے جو مصور نقشہ	لگے اس نقشے سے اپنے وہ ملانے نقشہ	غضنفر علی خان
تیرے جو یہی ستم رہیں گے	جیتے کاہے کو ہم رہیں گے	شیخ ولی اللہ محب
جسکو تری آنکھوں سے سروکار رہیگا	باالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا	محبت خان محبت
اس وعدہ فراموش نے آنے کو کہا تھا	دروازے پہ ہی رہنے لگے آٹھ پہر ہم	محمود خان محمود
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا	صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا	شرف الدین محمود
رقیبوں پر غضب ڈرہم گئے ہیں	ہوا زخمی کوئی مرہم گئے ہیں	سیّد مظفر علی خان
رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت	صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی	ممنون
مکتب میں بھی سبق تھا الف لام میم کا	طفلی سے ہی ہواہوں میں خوگر الم کیساتھ	ممنون
اس ابر میں بھی ساقی گلفام نہ آیا	کیا یار جو یاروں کے کبھی کام نہ آیا	محمد امان نثار
مجھ میں اور ان میں سبب کیا جو لڑائی ہوگی	یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی	محمد امان نثار
کسطرح ربط نہ ہو زلف سے دیوانوں کو	ربط ہوتا ہے پریشاں سے پریشانوں کو	میر نجف علی نجف
ہمنے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد	وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا	ولی محمد اکبرآبادی
سرد ہے بازارِ خوباں گرم بازاری نہیں	کتنے یوسف دیکھتا ہوں پر خریداری نہیں	واقف
کس کو حالِ دلِ غمگیں میں سناؤں اپنا	قیس صحرا میں نہیں کوہ میں فرہاد نہیں	شاہ حمزہ
عمر بھر اک جنونِ علم رہا	علم کیا ہے ہنوز علم نہیں	ذکی کاکوروی
خیرہ آنکھوں کو کریں ایسی بصارت بیکار	روشنی وہ جو بصارت میں اضافہ کردے	ذکی کاکوروی
اب تم بھی ذرا حسنِ جہاں سوز کو روکو	ہم تو دلِ بیتاب کو سمجھائے ہوئے ہیں	کیفی چریاکوٹی
زبانِ شمع کھلتی ہے نہ کچھ پروانہ کہتا ہے	مگر سارا زمانہ بزم کا افسانہ کہتا ہے	کیفی چریاکوٹی
ادھر تو طول دیا ہے امید کو اس نے	ادھر حیات عطا کی ہے مختصر مجھ کو	کیفی چریاکوٹی

بندگی بے چارگی ہے کیا ہنر پیدا کروں
در ہزاروں ہیں کہاں سے اتنے سر پیدا کروں
اس پہ مست جاخانہ درویش گر ہے بے چراغ
وہ اگر آئیں تو میں شمس و قمر پیدا کروں
دیر و کعبہ میں تو کچھ پایا نہیں میں نے سہیلؔ
اب یہ حسرت ہے کسی کے دل میں گھر پیدا کروں — سہیلؔ مالیگانوی

لکھتے رہو فسانے کہتے رہو کہانی
چمکا کے آئینہ سا رخصت ہوئی جوانی
تکتے نہیں ہیں مڑ کر کیسا پلٹ کے آنا
ٹوٹے ہوئے ستارے روٹھی ہوئی جوانی — ادیبؔ مالیگانوی

اب آنے والے کریں اس پہ قصرِ نو تعمیر
وفا و مہر کی بنیاد ہم تو ڈال چلے — مسلمؔ مالیگانوی

انقلاب دنیا میں خود بخود نہیں آتے
انقلاب آتا ہے انقلاب لانے سے — عتیقؔ احمد عتیق

یاد میری سنبھال کر رکھنا
میرا کیا میں رہا رہا نہ رہا — نشاطؔ شاہدوی

پھر یوں ہوا کسی نے بٹھایا نہ پاس میں
پیوند لگ گئے تھے ہمارے لباس میں — رزاق عادل

خلوت وجلوت میں جو دمساز ہیں۔

گزشتہ تین سو سال کی نمائندہ اردو شاعری سے شعری ضرب الامثال
اور شعری جواہرات کے انتخاب کا مجموعہ

''شعری جواہرات اور ضرب الامثال''

اس مجموعے میں ایسے اشعار ہیں جو دلوں کو چھوتے ہیں اور دماغ پر دستک دیتے ہیں۔ جو زندگی کے تلخ وشیریں حقائق اور تجربات کا خوبصورت اور حسین انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ جو کبھی ہنساتے ہیں اور کبھی رلاتے ہیں۔ جو پژمردہ دلوں کو حوصلہ بخشتے ہیں۔ جو بے کیف حیات میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ جو شکستہ اعصاب کو سکون کی دولت عطا کرتے ہیں۔ جو حوصلوں کو قوت اور تازگی بخشتے ہیں۔ جو زندگی سے قریب ہیں اور اسے بیش قیمت تجربات سے مالا مال کرتے ہیں۔ جو زبان زد عام ہیں۔ جو کوزے میں بند دریا ہیں۔ جو انسانی جذبات واحساسات کے حقیقی ترجمان ہیں۔ جو الفاظ کی شکل میں ہیرے جواہرات ہیں۔ جو رہنمائے تعمیر حیات ہیں اور جو تہذیب وشائستگی کے علم بردار ہیں۔ انہیں جب بھی اور جہاں سے بھی پڑھا جائے گا، یہ ہم درد، غم گسار اور دوست ہی نہیں بلکہ فکر وفن کی تازگی اور شگفتگی کا باعث بھی ثابت ہوں گے۔

مؤلف: محمد رمضان عبدالشکور

AQSA OFFSET PRINTERS, MALEGAON. PH. (02554) 230945